حکومتِ خود اختیاری

اور

ہندو مسلم مسئلہ کا حل



مصنفہ

سید طفیل احمد سابق ایم۔ ایل۔ سی۔ صوبۂ متحدہ

ولایت منزل علیگڑھ

سنہ ۱۹۳۸ عیسوی

ایک ہزار جلد

بار دوم

قیمت ایک روپیہ

فہرست مضامین

دیباچہ طبع ثانی

یہ کتاب پہلی بار دسمبر ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس سے
ایک سال قبل دسمبر ۱۹۲۷ء میں کانگریس کے اجلاس منعقدہ مدراس
میں ہندوستان کے لیئے اگرچہ آزادی کامل حاصل کرنے کا رزولیوشن
پاس ہوا تھا مگر اوس کے بعد سائمن کمیشن کا مقاطعہ کرنے میں چونکہ دوسری
مختلف الخیال جماعتوں کو ہم نوا بنانا مقصود تھا اس لیئے آل پارٹیز کانفرنس
نے ستمبر ۱۹۲۸ء میں بمقام لکھنؤ نہرو رپورٹ کو پاس کیا۔ جس نے ہندوستان
کا نصب العین نوآبادیات کی قسم کی حکومت خود اختیاری قرار دیا۔ پھر دسمبر
۱۹۲۸ء میں کانگریس نے حکومت خود اختیاری کو اس شرط پر منظور کیا
کہ اگر ایک سال کے اندر حکومت خود اختیاری نہ ملے تو کامل آزادی کا
اعلان کر دیا جائے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۲۹ء سے کانگریس کا اور اس سے
کچھ قبل سے جمعیۃ العلماء ہند کا نصب العین آزادی کامل ہے۔ کتاب "حکومت
خود اختیاری" میں اگرچہ ہندوستان کے لیے صرف حکومت خود اختیاری
کے حصول پر بحث کی گئی ہے۔ مگر ایک سیاسی تاریخ ہونے کی وجہ سے
ہر طرف سے اس کتاب کی مانگ ہے۔ اس لیے اوسے بجنسہ دوبارہ
طبع کرا کے آخر میں ایک باب کا اضافہ کر دیا گیا ہے جس میں گذشتہ

دس سال کی سیاسی تاریخ مختصر طور پر درج کی گئی ہے اور دکھایا گیا ہے
کہ کس طرح ہندوستان کی تمام جماعتیں رفتہ رفتہ ایک نقطہ پر آگئیں
اور سب نے نصب العین آزادی کامل قرار دے لیا۔ اور باوجود
باہمی اختلافات کے سب کے قدم آزادی کامل کی طرف بڑھ رہے ہیں
امید ہے کہ اگر بہ حیثیت ایک سیاسی تاریخ کے اس کتاب کے طبع ہونے
کی آئندہ نوبت آئی تو اُس وقت تک ملک کو کامل آزادی حاصل
ہو چکی ہوگی۔

طفیل احمد

۱۲/ اگست ۱۹۳۸ء

دیباچہ

بالعموم ایشیا میں اور بالخصوص ہندوستان میں لوگوں کے دماغوں پر یہہ خیال مستولی ہے کہ دنیا روز بروز بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔ برخلاف اس کے یورپ اور امریکہ میں اس کے برعکس خیالات ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا روز بروز ترقی کرتی جاتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ دونوں متضاد خیالات اپنی اپنی جگہ پر بالکل درست اور صحیح ہیں۔ یورپ اور امریکہ پانی نشوونما ہیں۔ دنیوی تمول میں ہردم آگے قدم بڑھا رہے ہیں اور ہندوستان جو کبھی تہذیب اور شائستگی کا گہوارہ اور دولت کا خزانہ تھا اب ہر اعتبار سے پیچھے ہٹ رہا ہے۔ اس کا علاج مدت دراز سے یہ سمجھا جا رہا ہے کہ اس ملک میں علوم جدیدہ کی اشاعت کی جائے۔ اور یورپ کے نمونہ پر صنعت و حرفت کا اجرا کیا جائے اور انہیں کاموں کے لیے اہل ہند مدت سے جان توڑ کوشش کر رہے ہیں مگر باوجود اس کے عام طور پر لوگوں کے خیالات یہی ہیں کہ حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی ہے۔ ان خیالات کی موجودگی کے دوران میں یورپ میں جنگ عظیم چھڑتی ہے اور ہندوستان اپنے حکمرانوں کی مدد کیلئے کھڑا ہو کر اس میں جان لڑاتا ہے اور اپنے لاکھوں آدمی قربان کر کے انگلستان کو کامیاب بناتا ہے۔ اس وقت دنیا کے پسماندہ ملکوں کی نسبت تجویز کیا جاتا ہے کہ اُن کی فلاح و بہبود کا ذریعہ صرف یہ ہے کہ اُنھیں آزادی دی جائے۔ سلطنت برطانیہ اس اصول کو تسلیم کر کے ہندوستان کو حکومت خود اختیاری عطا کرنے کا وعدہ کرتی ہے اور اُس کی پہلی قسط عطا بھی کرتی ہے۔ دس سال بعد جب دوسری قسط ملنے کا وقت قریب آتا ہے تو ہندوستان

ہیں مذہبی بلودں اور فرقہ وارانہ کشمکش کا دور آتا ہی اُس وقت سلطنت برطانیہ خالص انگریز ممبروں کا ایک کمیشن بھیجتی ہی جس پر اہل ہند ناراض ہو کر اُس سے مقاطعہ کرتے ہیں۔ اور اُن میں سے بہت سی جماعتیں باہمی سمجھوتہ کر کے اپنے مطالبات متعین کرتی ہیں۔ اُسی کے ساتھ ملک میں کچھ جماعتیں ایسی ہیں جو باہمی سمجھوتہ کو ناپسند کرتی ہیں۔ اس سے تمام ملک میں کشاکش اور باہمی اختلافات رونما ہوتے ہیں اور بے شمار مختلف فیہ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

یہ رسالہ اُن مختلف فیہ مسائل کے اسباب و علل کی تحقیق کی غرض سے لکھا گیا ہی۔ اِن اوراق میں سب سے پہلی کوشش یہ کی گئی ہی کہ ہندوستان کے گزشتہ دو سو سال کی سیاسی اور اقتصادی، تعلیمی اور اخلاقی حالت کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے کہ ملک کی گزشتہ اور موجودہ حالت پر غور کرنے کے بعد ہندوستان کے مسئلہ آزادی کے متعلق صحیح رائے قائم کی جا سکے اس امر کا خاص لحاظ رکھا گیا ہی کہ موجودہ نظام حکومت اور ملک کی گزشتہ حالت کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہی وہ انگریزوں کے اقوال پر مبنی ہی۔ مجھے اس امر کے کہنے کی ضرورت نہیں ہی کہ انگریز مصنفین اور مورخین کی تحریروں اور تقریروں کے حوالے تلاش کرنے میں مجھے کس قدر دقت پیش آئی۔ جن لوگوں کو تصنیف و تالیف سے واسطہ پڑا ہے وہ اس امر کو جانتے ہیں کہ ایک طبع زاد مضمون لکھنا بہ نسبت ایک ایسی تالیف کے جس کا مسالہ جمع کرنے کی غرض سے مختلف کتابوں کی ورق گردانی کرنا پڑے کس قدر آسان ہی۔ اس کتاب میں جو واقعات یا بیانات لکھے گئے ہیں اُن کی تائید میں کوئی نہ کوئی سند ضرور پیش کی گئی ہی۔ انگریزوں کی تحریرات سے سند لینا کوئی قابل فخر بات نہیں یہ بالکل ممکن تھا کہ ان کے سوا دوسرے حوالے بھی پیش کیے جائیں۔ لیکن مغربی دُنیا کو بیانات کی

صداقت منوانے کے لیئے اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ کار نہ تھا کہ خود اُنھیں کی قوم
کے افراد کی رائیں اور تجربے جو غریب ہندوستان کی مظلومانہ حالت کے اظہار کی
غرض سے وقتاً فوقتاً معرض تحریر میں آئے ہیں دُنیا کے سامنے رکھ دیئے جائیں۔ یہ
رسالہ اگرچہ تمام ملک کی حالت پر مشتمل ہی مگر چند صفحات مسلمانوں کے لیئے مخصوص کر دیئے
گئے ہیں جن میں تفصیلی حالات دکھا کر اُن کے اور ہندوؤں کے باہمی تعلقات پر تبصرہ کیا
گیا ہی اور اپنی دانست میں اس اہم مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہی کیونکہ درحقیقت
ہندو مسلم مسئلہ کا حل گویا ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ کا حل ہی۔ میرے قلب پر مسلمانوں
کی مخصوص حالت کا اثر زیادہ تر اس وجہ سے ہی کہ میرے تعلقات مسلمانوں کے مرکز
علی گڑھ سے پوری نصف صدی سے ہیں اور علی گڑھ چونکہ عرصہ دراز سے مسلمانوں کی
تعلیمی، تمدنی، سیاسی اور اقتصادی تحریکات کا مرکز رہا ہی اس لیئے کم و بیش مجھے ان تمام
تحریکات سے واقفیت حاصل کرنے اور مسلمانوں کی حالت کے متعلق رائے قائم کرنیکا
موقعہ ملا ہے۔ اور اب جب کہ ہندوستان ایک نازک حالت سے گزر رہا ہے اور
جذبات عامہ جمہوریت کی طرف مائل ہو رہے ہیں برطانیہ کے مدبرین کے لیئے یہ سمجھنے کا
وقت آگیا ہے کہ شطرنج کی بساط پر جس طرح ایک کم زور پیادہ بادشاہ کا گھر بند کر دیتا ہے
کہیں کم بین الاقوامی بساط پر کہیں غریب ہندوستان بھی وہی کمزور پیادہ ثابت نہ ہو۔
اس لیے آج نہیں، تو کل برطانوی قوم کو اس کے جذبات کا احترام کرنا ہوگا اور مسلمانوں
کے لیے یہ ناممکن ہی کہ وہ ہندوستان کی دوسری قوموں کا حصول آزادی کے مسئلہ میں
ساتھ نہ دیں۔

مجھے اُمید ہی کہ اس کتاب کو مطالعہ کرنے کے بعد مسلمانوں کو ہندوستان کی موجودہ

سیاسیات میں صحیح رائے قائم کرنے کا موقعہ ملے گا لیکن یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا جا سکتا
کہ میری رائے اِس اہم معاملہ میں صحیح ہے تاہم میرا فرض تھا کہ میں اپنے نظریات کو ملک کے
سامنے پیش کر دوں میری دلی خواہش ہے کہ جن امور کی نسبت میں نے اظہارِ خیال کیا ہے
اگر وہ قابلِ توجہ ہیں تو بالخصوص مسلمان اور بالعموم دوسرے اصحاب اُن امور کے
مخالف یا موافق اظہارِ رائے کریں تاکہ بحث و تبادلۂ خیالات سے ہم صحیح نتیجہ پر پہونچکر جلد
از جلد حکومتِ خود اختیاری کے مقصد کو حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں۔

قبل اس کے کہ میں اس دیباچہ کو ختم کروں میں اُن حالات کے متعلق جو اس وقت
ملک میں پیدا ہو رہے ہیں صاف الفاظ میں اپنی رائے ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔ اہلِ ہند
کے دلوں میں یہ جذبہ تو ضرور پیدا ہو گیا ہے کہ وہ خود اپنے ملک پر حکومت کریں۔ مگر
جب حکومت خود اختیاری کی قسطیں ملنے کا وقت آتا ہے تو وہ آیندہ نظامِ سلطنت
کی جزئیات پر موشگافیاں کر کر کے تمام کھیل بگاڑ دیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر
انہیں اس امر کا اندازہ ہی نہیں کہ موجودہ نظامِ سلطنت سے ملک و قوم کو کس درجہ
نقصان پہونچا اور پہونچ رہا ہے اور اُس وقت تک پہونچتا رہے گا جب تک کہ یہ
نظامِ سلطنت نہ بدلے۔

ہندوستان میں جب یہ نظامِ سلطنت قائم ہوا تو بعض سمجھدار انگریزوں نے
ابتدا ہی سے کہنا شروع کیا کہ اس سے نہ صرف ہندوستان کو بلکہ انجام کار انگلستان کو
بھی نقصان پہونچکر رہے گا۔ ہندوستان کے نقصان کی نسبت لارڈ میکالے نے کہا
تھا کہ زمانۂ سابق میں جس طرح زوردار اور با اثر لوگوں کو افیون کے پوست پلا کر کاہل پست
ہمت اور بدعقل بنا دیا جاتا تھا ہمارا نظامِ سلطنت اسی طرح اہلِ ہند کو بیکار کر دیگا۔

چنانچہ اس نظام کے قائم ہونے کے وقت ہندوستان دنیا میں سب سے زیادہ دولت مند ملک تھا اُس کی دولت "لازوال" سمجھی جاتی تھی اور وہ دنیا کا باغِ ارم بنا ہوا تھا۔ یہاں کی اخلاقی حالت اس اعلیٰ پایہ پر پہونچی ہوئی تھی کہ ڈاکو اور ٹھگ جھوٹ بولنے پر موت کو ترجیح دیتے تھے اور آج دو سو سال میں یہہ ملک اپنے درجہ سے گر کر افلاس کے اعتبار سے اوّل نمبر پر آگیا اور اخلاق کے اعتبار سے خواہ اُس کی کیسی ہی حالت ہو مگر دُنیا کی نظروں میں اس قدر گر گیا ہے کہ امریکہ سے ایک عورت آکر یہاں کے لوگوں سے بدترین بد اخلاقیاں منسوب کرنے کی جرائت کرتی ہے۔

اِن ذلتوں سے تنگ آکر اہلِ ہند کے دلوں میں اپنی عزت اور حب وطن اور آزادی ملک کے خیالات پیدا ہوتے ہیں مگر بدقسمتی سے یا تو وہ اپنے اپنے فرقوں کی حکومت کی تمنا پر مبنی ہوتے ہیں یا انگریزوں کی نفرت پر۔ نتیجہ یہ کہ جب ایک فرقہ کو شبہ ہوتا ہے کہ آیندہ نظام میں دوسری قوم کی حکومت ہو جائے گی تو اُس وقت انگریز حکمرانوں کی نفرت دلوں سے کم ہو جاتی ہے اور آزادی ملک یا حکومت خود اختیاری کا منصوبہ خاک میں ملا دیا جاتا ہے اور پھر باہمی جنگ و جدل کا مشغلہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اور پھر چند سال بعد اس سبق کو دوہرا دیا جاتا ہے۔

یہ سب اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اہلِ ہند کو اس امر کا اندازہ ہی نہیں کہ دو صدیوں سے ہندوستان سے کس قدر دولت کھنچ کر انگلستان کو جا رہی ہے اور اُس سے یہاں کی صنعت و تجارت کس درجہ گر رہی ہے۔ اور شدت افلاس سے تمام ملک کی اخلاقی حالت کس سرعت سے گرتی جاتی ہے اور اس حالت میں

جو منٹ گزر رہا ہے اُس سے فی الجملہ کس قدر نا قابلِ تلافی نقصان ہندوستان
کو پہونچ رہا ہے اور نہ صرف ہندوستان کو یہ نقصان پہونچ رہا ہے بلکہ خود سلطنت
برطانیہ اپنے بلند پایہ سے گر رہی ہے اور ہمدرد اور مدبرین انگریزوں کی پیشین گوئی
پوری ہو رہی ہے اور میرا خیال یہ ہے کہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں، سکھوں اور پارسیوں
عیسائیوں اور انگریزوں کو اس امر کا احساس ہو جائے کہ ہندوستان کا نظام سلطنت
بدل کر یہاں حکومت خود اختیاری قائم ہو جانے سے ہندوستان کی حالت بہتر اور
انگلستان کی حالت زیادہ مضبوط اور مستحکم ہو جائے گی تو اُس وقت غالباً تمام قوموں
کے دلوں سے ایک دوسرے کی بدگمانی کے خیالات نکل جائیں گے۔ اگرچہ اُن میں سیاسی
پارٹیوں کی بنا پر اختلافات ہوں گے اور خانہ جنگیاں ہوں گی تاہم سب کا ہر ہر قدم
متفقہ نصب العین کی طرف بڑھتا رہے گا اور انجام کار سلطنت برطانیہ مع اپنی تمام ماتحت
نوآبادیات کے جس میں ہندوستان بھی شامل ہوگا دنیا کی سب سے زیادہ پائدار اور
بارونق اور حقیقی معنوں میں معزز سلطنت ہوگی اور دُنیا کے لیئے اخلاقی، دماغی اور
مادّی اور ہر اعتبار سے ایک بہترین نمونہ ہوگی۔

خاکسار

طفیل احمد

علی گڑھ۔ ۱۲ر دسمبر ۱۹۳۸ء



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱)

تمہید

ہندوستان ترقی کر رہا ہے یا تنزل؟

۱۔ ہندوستان اپنی پہلی حالت کے مقابلہ میں ترقی کر رہا ہے یا تنزل؟ یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ بعض اصحاب یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہندوستان میں قیام امن اور وسائل آمد و رفت کی سہولت کی وجہ سے ہر قسم کی ترقی ہے۔ اُس کے مقابلہ میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو نہ صرف زبان سے کہتے ہیں بلکہ دل سے سمجھتے ہیں کہ باوجود ریلوں سڑکوں اور نہروں کی زیادتی کے اُن کے ملک کا افلاس روز بروز بڑھ رہا ہے اور اُن کے مصائب میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ مگر اِن دونوں متضاد خیال کے اصحاب میں سے اس امر واقعی سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ کسی زمانہ میں ہندوستان کی دولت کی دنیا بھر میں دھوم تھی جس کی وجہ سے یورپ کی قومیں اُس کی تلاش میں دنیا کے وسیع سمندروں میں سرگرداں پھرا کرتی تھیں چنانچہ اُنھیں مہمات میں سے ایک مہم میں اُنھیں امریکہ کے جزائر کا پتہ ملا

جن کو انھوں نے ہندوستان سمجھکر اُن کا نام جزائر ہند رکھدیا۔ اور بعد میں ہندوستان کا پتہ چلنے پر امریکہ کے جزائر کے نام کے ساتھ "مغربی" کے لفظ کا اضافہ کرنا پڑا تاکہ اصلی ہندوستان میں اور امریکہ کے جزائر میں امتیاز باقی رہے۔ بہرحال سولھویں صدی سے یورپ کے متعدد ملکوں کی تجارتی کمپنیاں ہندوستان سے روپیہ کمانے کے لیے یہاں ٹوٹ پڑیں اور اٹھارہویں صدی میں باہمی کشمکش کشت وخون اور جنگ وجدل کے بعد اُن میں سے انگلستان کی ایسٹ انڈیا کمپنی سب پر غالب آئی اور ۱۸۵۷ء کی جنگ ملا پسی میں اس نے اپنی حکومت کا جھنڈا گاڑ دیا اور اُس کے کل ۱۰۰ سال بعد وہ ہندوستان جو دنیا کے ملکوں میں دولت کے اعتبار سے نمبر اوّل پر تھا برخلاف اُس کے آج افلاس کی فہرست میں نمبر اوّل پر نظر آرہا ہے۔

کاش افلاس ہی پر بس ہوتی مگر اب رونا تو یہ ہے کہ تمدّن و معاشرت تہذیب اور انسانیت اخلاق و عادات سب کے اعتبار سے اس ملک کے لوگ دُنیا بھر میں پست ترین سمجھے جاتے ہیں۔ اور جب وہ یا اُن کے ہمدرد کسی قسم کی آزادی یا حقوق کا مطالبہ کرنے اُٹھتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ وہ پہلے اپنی تعلیمی اخلاقی اور تمدنی حالت درست کرکے اپنے کو اہل ثابت کریں تب کہیں مراعات پانے کے مستحق ہوسکیں گے۔

اس قسم کے جوابات پاکر مختلف ملتوں اور فرقوں کے رہنما اپنی اپنی قوم کے لیے تدابیر سوچتے ہیں۔ ایک اشاعت تعلیم کے لیئے اُٹھتا ہے تو دوسرا اصلاح تمدّن کے لیے ایک مذہبی اور اخلاقی اصلاح کے لیے کمربستہ ہوتا ہے

تو دوسرا اقتصادی حالت کی درستی کے لئے مگر ایک ایک کرکے سب ناکام ہوتے اور تھک تھکا کر بیٹھ جاتے ہیں اور کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

۲۔ ملکی بہبودی کی تحریک میں انگریزوں کا حصّہ | اس موقع پر میں یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جس بربادی کے درجہ پر اب ہندوستان پہونچ گیا ہے۔ اُس کی کلیتاً ذمہ داری انگریزی قوم پر نہیں ہے۔ بڑی ناانصافی ہوگی اگر اس بارہ میں بنی نوع انسان کے اُن بہی خواہ انگریز حکام کا تذکرہ نہ کیا جائے جنھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے قائم ہونے سے اس وقت تک اہل ہند کی ہمدردی میں مسلسل تحریرات انگلستان کو بھیجیں اور اپنی رپورٹوں۔ اور شہادتوں میں اس امر کو واضح کیا کہ جس قسم کا نظام اس ملک میں قائم کیا گیا ہے وہ انجام کار ہندوستان کو ہلاکت کے اس درجہ تک پہونچائے گا کہ اُسے ایک وقت میں خود انگلستان سر پکڑ کر روئے گا۔ انگریزی عملداری کے قائم ہونے کے ایک سو سال کے اندر تک محض انگریزوں ہی کی طرف سے اہل ہند کیلئے حقوق کے مطالبے کئے جاتے تھے اور اُن میں ایک ہندوستانی بھی شریک ہونے کی جرارت نہ رکھتا تھا۔ البتہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانیوں میں غالباً سب سے اوّل سرسید نے اسباب بغاوت ہند لکھ کر غدر کا الزام خود سلطنت کے نظام حکومت پر قائم کیا۔ اُس کے بعد ملک میں تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک جماعت پیدا ہوگئی جو اُسی طریقے کے مطابق جو ہمدرد انگریزوں نے قائم کر دیا تھا گورنمنٹ کے سامنے مطالبات پیش کرتی رہی۔ حتیٰ کہ وہ وقت آیا جبکہ ایک انگریز مسٹر اے او۔ ہیوم کی مدد سے انڈین نیشنل کانگریس

قایم ہوئی۔ اور ناظرین میں سے بعض اصحاب کو جو واقف نہیں ہیں یہ معلوم ہو کر حیرت ہوگی کہ اس سیاسی جماعت کے قیام میں خود ہندوستان کے حاکم اعلیٰ کا بڑا حصہ تھا۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ مسٹر ہیوم نے لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند کے سامنے جب وہ تازہ ولایت تھے بج کے طور پر اپنی تجاویز نسبت اصلاح تمدن پیش کر کے ایک سوسائٹی قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اُس وقت لارڈ ڈفرن نے صاف الفاظ میں اہل ہند کے مرض کا صحیح علاج تجویز کر کے مسٹر ہیوم کو مشورہ دیا کہ بجائے اصلاح تمدن کے سیاسی تنظیم کا کام کیا جائے جو سب سے زیادہ اہم ہے۔

لارڈ ڈفرن نے حسب ذیل الفاظ میں اپنے خیال کا اظہار فرمایا:۔

"اس ملک میں ایسے لوگوں کی کوئی جماعت نہیں ہے جو مثل انگلستان کے ملک معظم کی مخالف جماعت کے کام کرتی ہو۔ چونکہ انگریزوں کو یہ علم نہیں کہ ہندوستانیوں میں اُن کی نسبت اور اُن کی پالیسی کی نسبت کیا خیالات ہیں۔ حاکم اور محکوم دونوں کے لیے یہ مفید معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے سیاست داں اصحاب سالانہ جمع ہو کر گورنمنٹ کو یہ بتائیں کہ اُس کا نظام کن امور میں ناقص ہے اور اُس کی حالت کس طرح بہتر کی جا سکتی ہے"

(ملاحظہ ہو کتاب انڈین نیشنل ایولیوشن مصنفہ اے۔ سی۔ مزمدار صفحہ ۱۵)

چنانچہ اسی مشورہ کے مطابق دسمبر ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس پونا میں منعقد ہوا۔ یہ کانگریس اگرچہ خود لارڈ ڈفرن کے مشورہ سے قائم ہوئی مگر اُس کے پر زور مطالبات سے بعد میں لارڈ موصوف کسی قدر

کبیدہ خاطر ہو گئے۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ حکمراں جماعت کے کچھ لوگ اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے والوں کو سلطنت کا مخالف سمجھنے لگے حالانکہ اس خیال کے انگریزوں سے واجبی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ "اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست"

۳۔ حکومت خود اختیاری کا اعلان !!!

کانگریس قائم ہونے کے اکیس سال بعد سنہ ۱۹۰۶ء میں کانگریس کے اجلاس میں سوراج کا ریزولیوشن پہلی بار پاس ہوا اور اس کے گیارہ سال بعد ۲۰ اگست سنہ ۱۹۱۷ء کو انگلستان کی پارلیمنٹ نے اہل ہند کے اس نصب العین کو حسب ذیل الفاظ میں تسلیم کر لیا:۔

"حضور ملک معظم کی پالیسی جس سے گورنمنٹ ہند بالکل متفق ہے یہ ہے کہ ہر شعبہ انتظامی میں ہندوستانیوں کا اضافہ ہو اور خود مختار جماعتوں کا رفتہ رفتہ نشو و نما بدیں غرض کیا جائے کہ ہندوستان میں بتدریج حکومت خود اختیاری قائم ہو کر سلطنت برطانیہ کا جزو اعظم بنے۔"

اس اعلان شاہی کے بعد حضور لفٹننٹ گورنر صوبۂ متحدہ نے الہ آباد یونیورسٹی کے جلسۂ کانوکیشن کے ایڈریس میں حسب ذیل ارشاد فرمایا:۔

"سلطنت برطانیہ نے اعلان کیا ہے کہ ہندوستان کا نصب العین حکومت خود اختیاری ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ملک کا انتظام بذریعہ ایک انتظامیہ جماعت کے کیا جائے جو بذریعہ ایک قانونی منتخب شدہ جماعت کے قائم ہوئی ہو اور وہ منتخب شدہ جماعت عوام الناس کے سامنے جوابدہ ہو اور اب ہمیں اپنا راستہ اس نصب العین کی طرف قائم کرنا ہے"

اس اعلان شاہی کے مطابق سنہ ۱۹۲۰ء میں حکومت خود اختیاری کی

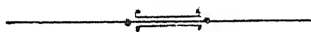
ایک قسط لیجس لیٹو کونسلوں کی صورت میں اہلِ ہند کو مل گئی جس کا عرصہ سات سال سے تجربہ ہو رہا ہے اور جس کی وجہ سے ہندوستان میں حکومت خود اختیاری کی ایک جھلک نظر آنے لگی ہے۔ اس اعلان سے اہلِ ہند کو جس قدر بھی خوشی ہو کم ہے یقین کامل ہے کہ جن نیک دل انگریز حکام نے اس وقت سے ایک صدی پیشتر سے ہندوستانیوں کی حمایت میں بے شمار تحریرات پارلیمنٹ کو بھیجی تھیں اور جو اب دنیا میں نہیں موجود ہیں اون کی روحوں کو ہم سے کچھ کم مسرت نہ ہوئی ہوگی۔ مگر بدقسمتی سے اس وقت ایسے انگریز بھی موجود ہیں جنھیں اپنے ہاتھوں سے اختیارات کا نکلنا ناگوار ہے اور جو ذاتی منافعے انھیں پہلے حاصل تھے اور اب اُن میں کمی آتی جاتی ہے اُن کو وہ سلطنت برطانیہ کے واقعی نفع پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان خیالات کے اصحاب ہر طرح یہی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہندوستان کو استحقاق سے زیادہ مل چکا اور جو کچھ انھیں ملا ہے اُس کا وہ خراب استعمال کر رہے ہیں اس لیئے اُن سے وہ اختیارات واپس لے لیئے جائیں یا کم سے کم اُنھیں آیندہ کچھ نہ دیا جائے۔

۴۔ حکومت خود اختیاری سے ہندوستان کی بے اطمینانی

خیر وہ لوگ جن کے ہاتھوں سے اختیارات نکل رہے ہیں وہ ہندوستانیوں کے موجودہ اختیارات کی نسبت جو کچھ بھی رائے رکھیں حق بجانب ہیں۔ کیونکہ اس سے اُن کا ذاتی نقصان ہے۔ مگر اُسی کے ساتھ خود ہندوستانیوں میں ایسے اصحاب موجود ہیں جو اس ملک میں حکومت خود اختیاری کے تجربہ سے غیر مطمئن ہیں

وجہ یہ ہے کہ اب تک جو چیزیں ہندوستانیوں کے قبضہ میں آئی ہیں اُن کی حالت اگر بدتر نہیں تو بہتر بھی نہیں ہے۔ میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں صفائی اور سڑکوں کی حالت خراب ہے۔ غبن اور خیانت کا بعض جگہ دور دورہ ہے بعض ممبروں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ناموں سے ٹھیکے لے لے کر خوب خوب کمائیاں کر رہے ہیں۔ پھر یہ جس فرقہ کا جہاں غلبہ ہے وہ اپنے اپنے لوگوں کو وہاں ٹھونس رہا ہے اور دوسرے فرقہ کے لوگوں پر زیادتیاں کرنا ایک مذہبی اور قومی خدمت سمجھتا ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر لوگ چیخ اُٹھتے ہیں کہ" خدا ہمیں ایسے سوارج سے بچائے"

مگر باوجود ان ناگوار تجربوں کے آئے دن حکومت خود اختیاری کا غلغلہ رہتا ہے۔ کچھ دنوں تو یہاں ترک موالات کا دور رہا جس کے اثر سے معدودے چند لوگ ہی بچ سکے ہوں گے۔ جب وہ ٹھنڈا پڑا تو اب سائمن کمیشن کے مقاطعہ کے سلسلہ میں ہر طرف اُسی حکومت اختیاری کا چرچا ہو رہا ہے۔ یوں شریک ہونے کو تو مسلمان بھی اُس میں شریک ہیں مگر اقلیت میں ہونے کی وجہ سے اُن کے دلوں میں حکومت خود اختیاری کی طرف سے طرح طرح کے شکوک ہیں اس لیئے ضرورت ہے کہ بہ حیثیت قوم کے اس تحریک کے مفاد و مضرت کو بہ نظر امعان دیکھا جائے اور اُس کا تجزیہ کر کے اُس کے ہر پہلو پر غور کیا جائے اور اس رسالہ کے لکھنے سے یہی ہماری غرض ہے۔



(۲)

ایسٹ انڈیا کمپنی کا تجارتی دور

۵۔ زمانۂ سابق کا ہندوستان

مگر ہندوستان کی موجودہ حالت اور اہلِ ہند کے اس نصب العین پر نظر ڈالنے سے قبل ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس عملداری سے قبل ہندوستان میں کس قسم کی حکومت تھی۔ یہ امر ظاہر ہے کہ ہندوستان بوجہ اپنی ضرب المثل دولتمندی کے ہمیشہ سے باہر کی اولوالعزم اور جنگجو اقوام کا آماجگاہ رہا ہے۔ بعض حملہ آور تو یہاں سے غارتگری کر کے زر و جواہر اپنے اپنے ممالک کو لیجایا کرتے تھے اور بعض یہاں رہ پڑتے تھے اور یہاں اپنا گھر بنا کر سیکڑوں برس تک حکومت کرتے تھے۔ مگر باوجود اس کے ملک کی دولت میں کمی کی جگہ زیاتی ہوتی جاتی تھی۔ یوں کہنے کو تو بادشاہ یا راجہ خود مختار رہوتا تھا۔ مگر عملاً وہ ہر ہر قدم پر رعایا کی عام رائے کا تابع ہوتا تھا۔ فوج کشی یا غصہ کے وقت کسی فرقہ یا مذہب کے خلاف کوئی بے عنوانی ہو جانا دوسری بات تھی مگر تسلط ہو جانے کے بعد ہر حکمران کا یہی معمول تھا کہ وہ اپنی رعایا کے ہر فرقہ کی دل دہی اور دلداری کرنے انھیں بڑے سے بڑے عہدے دینے میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرتا تھا۔ حتیٰ کہ ان حکمرانوں کے

جن کو آج متعصب ترین سمجھا جاتا ہے۔ فرمان اب تک موجود ہیں جن سے دیگر مذاہب کے پیشواؤں یا پوجاریوں کو جاگیریں اور روزینے عطا ہونا ظاہر ہوتا ہے اور جس کے کچھ کچھ آثار اب بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔

دوسری خاص بات پرانے نظام میں یہ تھی کہ اوپر کے طبقہ میں اگرچہ کامل شخصی حکومت تھی مگر اُسی کے ساتھ ادنیٰ طبقہ میں ایک حد تک جمہوریت تھی۔ اِس کا پتہ اس امر سے چلتا ہے کہ زمانہ سابق میں گاؤں میں دیہاتی پنچائتیں ہوتی تھیں جو اپنے معاملات کا خود انتظام کرتی تھیں اور اُن پر کسی قسم کے بیرونی اثرات نہ تھے۔ مرکزی حکومت ان کے اندرونی انتظام میں کوئی مداخلت نہ کرتی تھی۔ دیہات میں اس قسم کی حکومت کے نشانات کچھ دنوں پہلے تک پائے جاتے تھے۔ اکثر دیہات کے واجب العرض کے مطالعہ سے جو پہلے بندوبست کے وقت مرتب ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دیہات کے عہدہ داروں کی تقسیم کس طرح پر کی گئی تھی۔ کس طرح سے مواضع کے حصہ داروں اور ممبرداروں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ بدچلن اشخاص کو گاؤں سے خارج کر دیں اور یہ کہ کن طریقوں سے امن قائم رکھا جاتا تھا۔ اور یہ حالت بھی اُس وقت تھی جب کہ دیہات کی اندرونی زندگی میں کمپنی کی حکومت کا اثر پڑ چکا تھا۔ اب ہم پچھلے زمانہ پر یعنی اٹھارہویں صدی کے آخری حصہ پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت یہ دیہاتی پنچایتیں زیادہ مکمل حالت میں تھیں اس کا اندازہ ایک ایسے شخص کی تحریر سے ہوگا جو کوئی سیاح نہ تھا اور نہ کوئی انگریزوں کا مخالف تھا۔ جس نے ان چیزوں کو مخالفانہ نظر سے دیکھا ہوگا۔ بلکہ کمپنی کا معتمد ملازم تھا۔ اس کا تقرر ایسٹ انڈیا کمپنی کی

مالگذاری کی پالیسی کی تحقیقات کرنے کے لیئے ہوا تھا اِس افسر کا نام طامس منرو تھا جس نے آراضی کے مسئلہ کا مطالعہ کر کے دوامی بندوبست کی سفارش کی تھی اُس نے اپنی رپورٹ میں حسب ذیل ریمارک کیا ہے -

پنچایتیں | "ہر موضع مع اپنے بارہ پورووں کی مثل ایک چھوٹی سی ریاست کے ہے جس میں اُس کے مقدم پٹیل یا راڈی بطور اُس کے سردار کے ہیں اور ہندوستان اسی قسم کی ریاستوں کا ایک بڑا مجموعہ ہے - جنگ کے زمانہ میں باشندوں کی نظر اپنے گانوں کے سردار کی طرف ہوتی ہے - جب تک کہ اُن کا موضع محفوظ اور سالم رہے گانوں کے باشندے سلطنتوں کے ٹوٹنے اور تقسیم ہونے کے بارہ میں اپنے آپ کو کوئی تکلیف نہیں دیتے وہ اس امر کی کچھ پروا نہیں کرتے کہ ملک کس کے ہاتھ میں منتقل ہوتا ہے اور اندرونی نظام غیر مبدّل رہتا ہے - اور اِن تمام حالات میں گانوں کا سردار بدستور اپنے گانوں کا کلکٹر مجسٹریٹ اور کاشتکاروں کا سردار رہتا ہے"

"منو کے زمانہ سے آج ۱۸۰۶ء تک بندوبست موضع کے سردار کے ساتھ یا اُس کے مشورہ سے کیئے گئے ہیں - جب مالگذاری بہت زیادہ سمجھی جاتی اور موضع کا سردار اُس سے متفق ہو جاتا تو اُسے بالعموم رعایا کے ساتھ معاملہ طے کرنے کے لیئے چھوڑ دیا جاتا - اگر مالگذاری بہت کم ہوتی - اور موضع کا سردار اُسے بڑھانے کے متعلق اعتراض کرتا تو عملدار اُسکی موجودگی میں رعایا کے ساتھ معاملہ طے کرتا - یہ نظام صدیوں کے تجربہ میں کامیاب ثابت ہوا اور چونکہ اُس حالت میں تمام صوبجات نہایت سرسبز و شاداب رہے

اس لیئے سمجھنا چاہیئے کہ وہ زراعت کی ترقی کا بڑا ذریعہ تھا۔
موضع کے پنچوں کو چھوڑکر کاشتکاروں سے براہ راست تعلقات رکھنا یہ بعد کے زمانہ کی ایجاد ہے اور مرکزی حکومت کے اس طرز عمل نے دیہاتی پنچایتوں کی زندگی کا خاتمہ کردیا۔ اب پُرانے عہد سے صرف نام کو باقی رہ گئے ہیں۔ نمبرداروں کے فرائض تو موجود ہیں مگر حقوق ندارد ہیں۔ دیہاتی پنچایتوں کا سارا انتظام پاش پاش ہوچکا ہے بہرحال مندرجہ بالا تحریر سے ظاہر ہوگا کہ پہلے زمانہ میں دیہاتی زندگی مکمل تھی۔ دیہاتیوں کو اس کی کوئی پروا نہ تھی کہ بادشاہ کون ہے۔ کس قوم کا ہے۔ اس کا مذہب کیا ہے۔ ان کا تعلق بادشاہ سے صرف اس قدر تھا کہ وہ معین مالگزاری بطور خراج کے اس کو دے دیں وہ خود اپنے مجسٹریٹ یا پنچ مقرر کرتے تھے جو اپنی ذاتی واقفیت کی بنا پر بے گناہ اور گنہگار میں تمیز کر سکتے تھے۔ جن مقامات میں بیٹھکر انصاف کیا جاتا تھا وہ مقدس سمجھے جاتے تھے اور ہندوستانیوں میں پنچوں کے سامنے سچ بولنے کی عادت اس قدر زیادہ تھی کہ اب جب کہ اُن کی تمام خوبیاں زائل ہوچکی ہیں اب بھی دیہات میں زیادہ لوگ ایسے ہیں جو اپنی برادری کے پنچوں کے سامنے سچ ہی بولتے ہیں۔ غرضکہ بہ الفاظ سر طامس منرو تمام ہندوستان اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر مشتمل تھا۔

۲۔ ہندوستان کی لازوال دولت

یہ امر ظاہر ہے کہ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد سلطنت کمزور ہوجانے سے ملک میں ایک حد تک بدامنی ہوگئی تھی جس سے بدیہی طور پر ملک کی مالی حالت کو صدمہ پہونچا تھا مگر

چونکہ ملک سے باہر دولت نہ جاتی تھی اس لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری کے ابتدائی زمانہ تک ہندوستان کی خوش حالی کی جو کیفیت باقی تھی اُس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ لارڈ کلایو نے اس ملک کی دولت کو "لازوال دولت" قرار دیا تھا اور لارڈ میکالے نے کہا تھا:۔

"باوجود مسلمان ظالموں اور مرہٹہ لٹیروں کے مشرقی ممالک میں بنگال باغِ ارم یعنی نہایت دولت مند ملک سمجھا جاتا تھا۔ اُس کی آبادی بیحد و غایت بڑھتی تھی غلہ کی افراط سے دور و دراز کے صوبجات پرورش پاتے تھے اور لندن اور پیرس کے اعلیٰ خاندانوں کی بیبیاں یہاں کے کرگھوں کے نازک ترین کپڑے پہن میں ملبوس ہوتی تھیں (ماخوذ از سوانح لارڈ کلایو) ......

مسٹر ہابول اُن چند انگریزوں میں سے ہیں جو کلکتہ کے بلیک ہول کی قید سے بچ کر زندہ نکلے تھے۔ مگر جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک ریاست کو اپنے قبضہ میں لینے کا ارادہ کیا تو اُنھوں نے لکھا کہ فی الواقع وہاں کے خوشحال لوگوں کو پریشان کرنا تقریباً ظلم کی حد تک پہونچ جائے گا۔ کیونکہ اس ضلع میں ہی قدیم ہندوستان کی حکومت کی خوبصورتی، تقوی۔ باقاعدگی انصاف کے نقش پاموجود ہیں۔ یہاں لوگوں کی ملکیتیں اور اُن کی آزادیاں محفوظ ہیں۔ یہاں کسی قسم کی لوٹ مار سننے میں نہیں آتی۔ ایک مسافر کے پاس خواہ سامان تجارت ہو یا نہ ہو وہ فوراً گورنمنٹ کی نگرانی میں آجاتا ہے جس کے لیے بغیر کسی قسم کے خرچہ کے محافظ مقرر کر دیئے جاتے ہیں جو اُسے منزل بہ منزل پہونچاتے ہیں۔ اور یہ جان و مال کی حفاظت اور قیام کے جوابدہ

ہوتے ہیں۔

پہلی منزل کے ختم ہونے پر وہ چند خوشگوار مراسم کے بعد دوسرے محافظوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو اُس مسافر سے چند سوالات پچھلے محافظوں کے برتاؤ کے متعلق پوچھ کر اُنھیں اس برتاؤ کی سند اور مسافر کی رسید دیکر رخصت کر دیتے ہیں۔ یہ سند پہلی منزل کے افسر اعلیٰ کے پاس پہونچتی ہے اور وہ اُسے اپنے راجہ کے پاس بھیج دیتا ہے۔ اس طریقہ سے مسافر ملک میں گزارا جاتا ہی اور کھانے سواری اور قیام، سامان تجارت کی بار برداری میں اُس پر کسی قسم کے صرفہ کا بار نہیں ڈالا جاتا بجز اُس صورت کے کہ وہ تین روز سے زیادہ قیام کرے حتیٰ کہ اگر بیمار ہو جائے یا کوئی حادثہ پیش آ جائے تب بھی اُس سے خرچہ نہیں لیا جاتا اگر کوئی چیز اُس علاقہ میں مثل روپیہ کی تھیلی کے گم ہو جائے تو جس شخص کو مل جائے وہ اُسے پاس کے درخت پر لٹکا دیتا ہے اور قریب کی چوکی پہ اطلاع کر دیتا ہی۔ اور اس چوکی کا افسر فوراً اس کی منادی بذریعہ ڈھول پٹوانے کے کرا دیتا ہی۔

(ماخوذ از رسالہ ہالول)

۷۔ کمپنی کی عملداری میں تجارت کی بربادی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری ہونے کے دس سال کے اندر صوبۂ بنگال میں بدیہی تنزل ہو گیا۔ جیسا کہ لارڈ میکالے کی حسب ذیل تحریر سے ظاہر ہوتا ہے :۔

"کمپنی کے ملازموں کے عیوب میں محض ظلم ہی نہ تھا۔ بلکہ ظلم سے ایسے خراب نتائج پیدا ہو سکتے تھے۔ جیسا کہ دولتمند بننے کی بے اصول حرص سے پیدا ہوتے تھے" (ماخوذ از مضامین میکالے)۔

نواب صاحب بنگال نے انگریزی گورنر کو ۱۷۶۲ء میں لکھا تھا کہ کمپنی کے ملازموں اور رعایا اور سوداگروں کا مال و اسباب چوتھائی قیمت پر لے لیتے ہیں۔ اور اپنے ایک روپیہ کے سامان کی قیمت اُن سے جبریہ پانچ روپیہ وصول کرتے ہیں۔ (ماخوذ از خطوط نواب صاحب بنگال مورخہ مئی ۱۷۶۲ء)

لارڈ میکالے نے یہ بھی لکھا ہے کہ "اس طریقہ سے بے شمار دولت بہت جلد کلکتہ میں جمع ہو گئی۔ در آں حالیکہ تین کروڑ انسان حد درجہ برباد کر دیئے گئے بیشک اُن لوگوں کو مظالم میں رہنے کی عادت تھی۔ مگر وہ مظالم اس قسم کے نہ تھے۔ کمپنی کے لوگوں کی چھوٹی انگلی انھیں سراج الدولہ کے پٹھے سے زیادہ موٹی معلوم ہوتی تھی۔ پُرانے حکام کے زمانہ میں اُن کے ہاتھ میں ایک علاج تھا وہ یہ کہ جب ظلم ناقابل برداشت ہوجاتا تو وہ بغاوت کر کے حکومت کو توڑ دیتے تھے۔ مگر انگریزی حکومت ہلائے نہیں ہل سکتی تھی۔ یہ حکومت وحشیوں کی سی حد درجہ ظالمانہ حکومت ہونے کے ساتھ جدید تہذیب کے آلات کی طاقت سے مستحکم تھی۔ (ماخوذ از مضامین میکالے نسبت لارڈ کلایو)

اسی سلسلہ میں لارڈ کلایو نے یہ لکھا ہے:۔

"میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس قدر بد عملی۔ رشوت خواری اور زیادہ ستانی کا منظر بجز بنگال کے کسی ملک میں دیکھا یا سُنا نہیں گیا" (ماخوذ از سوانح عمری کلایو مصنفہ میالکم)

اسیطرح جان اسٹوارٹ مل مشہور ماہر اقتصادیات نے یہ لکھا ہے کہ "اودھ نہایت اعلیٰ درجہ کی خوش حالی کی حالت میں تھا اس کی آمدنی بغیر کسی قسم کے

جبر و تعدی کے تیس لاکھ روپیہ سالانہ کی تھی مگر نواب اودھ پر نہ صرف سپاہیوں کی فوج بلکہ سول افسروں کی ایک جماعت مسلط کر کے ہم نے اسے سخت ترین مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ اور اس نے ملک کو مفلس کر دیا تھی کہ چند سال تک اس قسم کے بار برداشت کرنے کے بعد اس کی آمدنی نصف رہ گئی۔ نو سال میں ناواجب تعدی کے ذریعہ سے صوبہ اودھ سے چونتیس لاکھ روپیہ سالانہ وصول کیا گیا۔ اسی حالت کے متعلق لارڈ کلایو نے ۱۷۶۵ء میں لکھا کہ "جو بدنظمی نظر آرہی ہے وہ کس چیز کا نتیجہ ہے۔ وہ نتیجہ چند لوگوں کی لوٹ مار عیش پسندی حرص اور تھوڑے عرصہ میں اس قدر دولت مند بن جانے کی ہوس کا ہے جو صرف چند لوگ ہی بن سکتے ہیں"

تجارت کے نام سے جو روپیہ کمپنی نے ہندوستان میں کمایا اس کی نسبت جماعت ڈائرکٹران نے ۱۷۶۶ء میں یہ لکھا کہ ہمارے نزدیک اندرون ملک کی تجارت سے جو کثیر دولت حاصل کی گئی وہ انتہا درجہ کے ظالمانہ اور جابرانہ طریقوں کے استعمال کا نتیجہ ہے اور جس کی نظیر کسی زمانہ اور کسی ملک میں نہ ملے گی"

۸۔ **صنعت کی بربادی** | کمپنی نے جو طریقے ملکی صنعت پر تنہا قابض ہو جانے کے اختیار کر رکھے تھے اس کے متعلق ۱۷۷۳ء میں مسٹر ولیم بولٹس نے فرمایا تھا:۔

"اصل یہ ہے کہ تمام اندرون ملک کی تجارت اور ایک خاص طریقے سے کمپنی کا یورپ میں روپیہ لگانا یہ سب مسلسل مظالم کا ایک منظر رہا ہے۔ جس کے مضر اثرات شدت کے ساتھ ہر نوربافت اور ہر کاریگر محسوس کر رہا ہے ہر سامان جو تیار کیا جاتا ہے وہ کمپنی کی مخصوص ملکیت ہو جاتا ہے اور انگریز

اپنے بنیوں اور کالے رنگ کے گماشتوں کی مدد سے خود رائی کے طریقہ پر یہ طے کرتے ہیں۔ کہ ہر کاریگر کتنا مال اور کس قیمت پر دے گا اور ان امور میں بالعموم غریب جولاہے کی رضامندی ضروری نہیں سمجھی جاتی۔ کیونکہ گماشتے جو کمپنی کے ملازم ہوتے ہیں اُن لوگوں سے جس چیز پر چاہے دستخط کرا لیتے ہیں اور اگر جولاہے روپیہ لینے سے انکار کرتے ہیں تو وہ روپیہ زبردستی ان کی کمر میں بندھوا دیا جاتا ہے اور پھر ان کے کوڑے مارے جاتے ہیں۔ اس محکمہ میں جو جو بدمعاشیاں کی جاتی ہیں وہ وہم و قیاس میں بھی نہیں آسکتیں۔ ہر چیز کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب جولاہے کو خوب ٹھگا جاتا ہے۔ کیونکہ کمپنی کے گماشتے جو قیمت مقرر کرتے ہیں وہ بالعموم بازار کی قیمت سے ۱۵ فی صدی سے لیکر ۴۰ فی صدی تک کم ہوتی ہے۔ اسی قسم کا غیر منصفانہ برتاؤ خام ریشم بننے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے اور اس امر کی مثالیں موجود ہیں کہ ان لوگوں نے ریشم کاتنے کی تکالیف سے تنگ آکر خود اپنے انگوٹھے کٹوا ڈالے تاکہ وہ اس جبر و تعدی سے محفوظ رہیں "

آگے چل کر ۱۷۸۷ء میں سر جان شور نے اپنی ایک یادداشت میں حسب ذیل بیان کیا " کمپنی کے لوگ ایک طرف تو تاجر ہیں اور دوسری طرف حکمران۔ اول الذکر حیثیت میں وہ ملک کی تجارت پر قابض اور ثانی الذکر حیثیت میں وہ مال گزاری وصول کرتے ہیں۔ مالگذاری یورپ کو بھیجنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ روپیہ کی جگہ ہندوستان کا مال خرید کر ولایت بھیجتے ہیں "

اس کے بعد ۱۷۹۰ء میں لارڈ کارنوالس نے ایک یادداشت میں یہ لکھا کہ

"جو کثیر دولت کہ کمپنی کھینچکر لے جاتی ہے اور اُس کے علاوہ جج کی کمائی سے جو روپیہ وصول کیا جاتا ہے اِس کا اثر شدت کے ساتھ اس ملک کی زراعت اور تجارت پر یہ پڑا ہے کہ یہ دونوں چیزیں گرتی جاتی ہیں۔"

۹- ہندوستانی اور انگریزی غمارداری کا مقابلہ

مسٹر ہیری ورلسٹ گورنر بنگال کی ایک کتاب سے جو اُنھوں نے "صوبہ بنگال میں انگریزی حکومت" کے عنوان سے لکھی تھی مندرجۂ ذیل اقتباس سے اس مضمون کے متعلق صحیح اندازہ ہوسکے گا وہ لکھتے ہیں:-

"پہلے زمانہ میں جو روپیہ دہلی کی مرکزی حکومت کو بھیجا جاتا تھا۔ وہ بنگال کے عظیم الشان تجارتی سامان کی قیمت کی صورت میں بنگال ہی کو واپس آجاتا تھا۔ اب یہہ زمانہ پہلے زمانہ سے کس قدر مختلف ہے اس صوبہ سے روپیہ کی طلبی کے لیے ہر طرف سے جو تقاضے آتے ہیں اُنھوں نے تمھارے خزانہ کو بالکل کھوکھلا کر دیا ہے اور اس ملک سے کثیر مقدار میں جو روپیہ کھینچا چلا جا رہا ہے اُس کے خراب نتائج سے سخت خطرات پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کوئی ملک خواہ کیسا ہی زیادہ دولتمند کیوں نہ ہو سرسبز ہونا تو درکنار زیادہ عرصہ تک اپنی موجودہ حالت کو بھی قائم نہیں رکھ سکتا۔ خاصکر اس صورت میں جب کہ بجائے کسی قسم کا اضافہ ہونے کے سالانہ آمدنی کے ایک ثلث کے بقدر ہر سال اس کا گھاٹا رہتا ہے اس زمانہ میں ایشائی فاتحین کی خونخواری کا اثر بہت جلد زائل ہوجاتا تھا۔ کیونکہ وہ مفتوحہ ملک کو اپنا گھر بنا لیتے تھے۔ خود ان کی ترقی و تنزل کا

انحصار اس ملک کی ترقی وتنزل پر ہوجاتا تھا جس میں وہ رہ پڑتے تھے۔
والدین اپنی آیندہ نسلوں کی بہبودی کی توقعات اسی ملک میں قائم کرتے تھے
اور ان کے بچے اپنے بزرگوں کی یادگاریں اُسی ملک میں پاتے تھے۔ ....

اگر کوئی خزانہ جبر وتعدی سے جمع کیا جاتا تھا تو وہ گھر ہاں خزانہ ہوتا تھا یا بعض
دفعہ اس کا یہ انجام ہوتا تھا کہ کوئی طاقتور یا مسرف شخص اُس پر قبضہ کرکے پھر
اُس کو اُسی ملک کے لوگوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ باوجود بہت سی بدنظمیوں کے اور
باوجود اس امر کے کہ حکمرانوں کی قوت میں بہت کم مزاحمت ہو سکتی تھی۔ ملک کی
ترقی کے قدرتی مواقع موجود تھے۔ روپیہ کمانے کے چشمے خشک نہ تھے اور اس لیے
ملک کی صنعت وتجارت سرسبز رہتی تھی حتیٰ کہ حرص اور سودخواری کا بھی نتیجہ یہ
ہوتا تھا کہ اس سے ملک میں دولت پیدا ہو کر وہ مفید کاموں کے لیے ایک قومی
سرمایہ کا کام دیتی تھی۔ کاشتکار اور کاریگر اگرچہ گراں شرح کا سود ادا کرتے تھے مگر
اُسی کے ساتھ وہ سرمایہ جہاں سے کہ وہ قرض لیتے تھے بڑھتا جاتا تھا۔ مگر انگریزی
عملداری میں معاملہ برعکس ہوگیا ہے۔ تاتاریوں کا حملہ ضرور شر انگیز تھا مگر اس کے
مقابلہ میں ہماری "حفاظت" کو دیکھا جائے کہ اس سے ہندوستان تباہ ہو رہا ہے
وہ ان کی عداوت تھی اور یہ ہماری دوستی۔ ہر ہر روپیہ جو ایک انگریز ہندوستان
سے کماتا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوستان کے ہاتھ سے جدا ہو جاتا ہے"

۱۰۔ تحصیل محاصل میں سفاکانہ طریقے | کمپنی کے ذمہ دار حکام نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسی کے خلاف جو متذکرہ صدر رہے اپنے احتجاج بلند کی تھیں۔
اس کے باوجود کمپنی کے رویہ میں کسی قسم کی تبدیلی نظر نہ آتی تھی۔ جس کا ناگزیر

انجام یہ ہوا کہ نہایت سخت اور تباہ کن قحط رونما ہوئے اِن قحطوں کی شدت کا
اندازہ ڈائرکٹران کمپنی کی رپورٹوں سے ہوسکتا ہے۔ مگر سوال یہہ ہے کہ آیا ڈائرکٹران
کمپنی نے ایسی معیبت کے وقت ہندوستان کی کوئی مدد کی یا انگلستان سے کوئی
چندہ بھیجکر اُس بے شمار دولت کا جو ہندوستان سے حاصل ہوئی تھی کوئی جزوی بدل
کیا اس کا جواب یہ ہے کہ وہ امداد تو کیا دیتے اُنھوں نے اپنی مالگزاری کے مطالبہ میں
بھی کسی قسم کی کوئی تخفیف نہیں کی۔ اس قحط کی کیفیت کے متعلق ڈائرکٹروں نے
اپنی رپورٹ مورخہ ۹ مئی ۱۷۷۰ء میں لکھا تھا کہ:۔

"جو قحط اس وقت نازل ہے اور اُس سے جو ہلاکت وفلاکت رونما ہے
وہ بیان سے باہر ہے صوبۂ پورنیہ جو کسی وقت آسودہ حال تھا اُسکی
ایک تہائی مخلوق لقمۂ اجل ہو چکی ہے"

پھر ۱۱ ستمبر ۱۷۷۰ء کو لکھا:۔

"یہاں کے باشندوں پر جو معیبت نازل ہے اُس کی تفصیل و تذکرہ میں
کتنا ہی غلو کیوں نہ کیا جائے اس پر مبالغہ کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ نظر برآں اِس
آشوب کا تحصیل پر جو کچھ اثر پڑا وہ کسی طور پر تعجب انگیز نہیں ہے۔ کیونکہ ہم کو اس
امر کے اظہار کرنے میں مسرت ہے کہ محاصل میں جس قدر کمی ہونے کا ہمیں خیال تھا
اُس سے برائے نام کمی ہوئی ہے"

پھر ۱۰ جنوری کو ڈائرکٹران نے لکھا کہ سال رواں میں وصولیابی کی حالت
ایسی عمدہ ہے جیسی کہ ہم چاہتے تھے اور ۳ نومبر ۱۷۷۲ء کو وارن ہیسٹنگز نے
کورٹ آف ڈائرکٹرز کو لکھا کہ:۔

"باوجودیکہ صوبہ کے باشندوں میں ایک ثلث کی کمی ہوگئی اور اسی نسبت سے رقبہ کاشت میں کمی ہوئی مگر ۱۷۷۱ء کی مال گذاری کی وصولی ۱۷۶۸ء کی رقم وصول شدہ سے بھی زیادہ ہے۔ قدرتی طور پر یہ خیال تھا کہ حد درجہ کی مصیبت کی وجہ سے اُسی نسبت سے وصول یابی میں کمی ہوگی۔ مگر کمی اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ وصولی میں سختی کی گئی جس سے رقم وصول شدہ گذشتہ معیار پر پہونچ گئی۔" (ماخوذ از حالات دیہات بنگال مصنفہ سرولیم ہنٹر)

خلاصہ یہ کہ اِن طریقوں سے کمپنی نے ہندوستان میں عملداری کی بایہ کہیے کہ بدعملی پھیلائی۔ باوجود چند دوراندیش اور صحیح الخیال انگریزوں کی مخالفت کے ہندوستان سے زرکشی کا سلسلہ جاری رہا۔ مگر چونکہ ڈائرکٹران کمپنی کی حرص کسی طرح پوری نہ ہوتی تھی اس لیے وہ وقتاً فوقتاً ہندوستان کے حالات کی تحقیقات کے لیئے کمیٹیاں مقرر کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں مسٹر مانٹگمری مارٹن نے صوبجات بنگال و بہار میں ۱۸۱۶ء میں دہ سالہ تحقیقات کے بعد جو رپورٹ مرتب کی اُس میں لکھا کہ "برطانوی ہند کو بقدر ڈیڑھ کروڑ پونڈ سالانہ کے جو زیر باری اُٹھانی پڑتی تھی وہ بارہ فی صدی سود در سود کے حساب سے تیس سال میں بہتر کروڑ پونڈ کی خطیر رقم تک پہونچتی ہے۔ یہ مسلسل اور المضاعف زیر باری اگر انگلستان کو بھی اُٹھانی پڑتی تو وہ بالکل محتاج اور بے نوا ہوجاتا پھر اس کا اثر ہندوستان پر کس قدر سخت ہونا چاہیئے جہاں ایک مزدور کی یومیہ آمدنی دو پائی سے تین پائی تک ہوتی ہے یہ انسانی فلاکت و پستی کا کیسا روح فرسا منظر ہے۔ (ملاحظہ ہو صفحہ ۲۷۸ کتاب افلاس ہند مصنفہ دادابھائی نوروزجی)

انگریزی عملداری سے قبل ہندوستان اور اہلِ ہند کی بے شمار دولت کے متعلق انگریزوں کے اقوال ابتدائے کتاب میں نقل کیے جا چکے ہیں اُن کے مقابلہ میں ہندوستان کی جو حالت ۱۹۱۶ء میں ہوگئی تھی اس کا اندازہ ناظرین کو مسٹر منٹگمری مارٹن کی حسب ذیل تحریر سے بخوبی ہوسکے گا۔

"وہ واقعات ایسے بدیہی اور نمایاں ہیں کہ ان کا نظرانداز کرنا تقریباً ناممکن ہے وہ یہ کہ ایک طرف تو ملک زرخیز اور زرپاش ہے اور دوسری طرف ملک کے باشندے مفلس اور غریب ہیں۔ یہ کس قدر عجیب وغریب متضاد باتیں ایک جگہ جمع ہوگئی ہیں[1]"

۱۱۔ اہل ہند کے اخلاقی تنزل کی وجہ | ہندوستان میں انگریزی عملداری کی ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ ہندوستانی ابتدا سے بڑے عہدوں سے قطعاً خارج کر دیے گئے۔ قوانین بنانے میں اور ملک کے لوگوں کے درمیان انصاف کرنے میں ان کا کوئی اختیار باقی نہیں ہے۔ عملداری کی اس خصوصیت کے مضر اثرات کا اندازہ منجملہ دیگر انگریزوں کے سرطامس منرو کو بخوبی ہوا جس کا اظہار انھوں نے اپنی رپورٹ میں حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

"وضع قوانین میں ہندوستانیوں کا کوئی حصہ نہیں اور قوانین کے عملدرآمد میں ان کو بہت کم دخل ہے باستثنا چند نہایت چھوٹے عہدوں کے کسی بڑے عہدہ تک خواہ وہ فوجی ہو یا سول وہ نہیں پہونچ سکتے۔ وہ ہر جگہ ایک ادنیٰ قوم کے فرد سمجھے جاتے ہیں .... تمام فوجی اور دیوانی عہدے جو کچھ بھی اہمیت

[1] صفحہ ۱۶۶ دت جلد دوم۔

رکھ سکتے ہیں اب یورو پینوں کے قبضہ میں ہیں جن کا پس انداز روپیہ خود اُن کے ملک کو چلا جاتا ہے "

جان سلیمن نے اپنی شہادت میں بیان کیا:۔

"ایک[1] عنصر ہمارے لیئے نہایت گراں ہے اور وہ عنصر یورو پینوں کا ہے جس کی وجہ سے ہماری آمدنی کا بڑا حصّہ نکل جاتا ہے اور اسی وجہ سے ہمارے انتظامی محکمہ جات بہت زیادہ گراں ہیں "

ملک کے تمام ذمہ داری کے عہدوں سے ہندوستانیوں کے خارج ہونیکا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ اعلیٰ انتظامی قابلیت پیدا کرنے کے مواقع جاتے رہے اور جو کچھ بھی ان کی قابلیت تھی وہ رفتہ رفتہ زائل ہو گئی۔ اسی کے ساتھ اُن کے مالی تنزل نے اُن کے اخلاق و عادات کو گرا کر اس درجہ پہ پہونچا دیا جس پر کہ مظلوم اور محکوم قومیں پہونچ جاتی ہیں۔ اس سب پر اضافہ یہ ہوا۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ کہ اُن پر ایسے قوانین کے ذریعہ سے حکومت شروع کی گئی جن سے وہ مانوس نہ تھے اور جو ایک ایسی زبان میں تھے جسے وہ سمجھ نہیں سکتے تھے۔ دیوانی کا عدالتی نظام بھی اُن کے لیے اجنبی تھا جس کی تصدیق لارڈ میکالے کی حسب ذیل تحریر سے ہوتی ہے:۔

"بہت[2] کم انگریز ایسے ہوں گے جو اس امر کو تسلیم نہ کریں گے کہ انگریزی قانون باوجود حال کی ترقیوں کے نہ تو سستا ہے اور نہ اس کی روسے فیصلے جلد ہوتے ہیں۔ پھر بھی ہمارے ملک یعنی انگلستان میں اس کا نشوونما

---

[1] صفحہ ۱۱۴ دت جلد اول [2] مکالے ایسز وارن ہیسٹنگز صفحہ ۶۳۰ ۔ ۶۳۲ ۔

ہوگیا بعض امور میں وہ ہمارے محسوسات کے مطابق ڈھال دیا گیا۔ اور بعض امور میں ہمارے محسوسات رفتہ رفتہ اس کے مطابق ڈھل گئے ہیں ہمیں اس کے بدترین نقائص کو برداشت کرنے کی بھی عادت ہوگئی ہے اور اس لیے اگرچہ ہم اس کی شکایت کیے جائیں تاہم اس کی ہم پر ایسی ہیبت طاری نہیں ہوتی جیسی کہ ایک معمولی سی نئی تکلیف دہ چیز کی ہوتی ہے۔ مگر ہندوستان میں بالکل مختلف حالت پیدا ہوگئی ہے۔ انگریزی قانون جو انگلستان سے لایا گیا ہے اس میں تمام وہ برائیاں ہی موجود نہیں ہیں جن سے ہم انگلستان میں تکلیف اٹھا رہے تھے۔ بلکہ ان سے کہیں زیادہ ہیں اور وہ ایسی برائیاں ہیں جن کے مقابلہ میں انگلستان کی بدترین برائیاں ہیچ ہیں۔ وہ قانون جو کہ انگلستان میں دیرطلب ہے اس ملک میں اس سے کہیں زیادہ دیرطلب ہے جہاں کہ ہر جج کو اور ہر بیرسٹر کو ایک مترجم کی امداد درکار ہوتی ہے اس ملک میں یہ قانون کہیں زیادہ گراں ہے جس میں کہ مشیران قانونی ایک دور دراز ملک سے لائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں ہر انگریز کی محنت کا معاوضہ گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف سے لیکر ایک سائیس یا گھڑی ساز تک کا انگلستان کی شرح سے کہیں زیادہ ادا کیا جاتا ہے۔

ان وجوہ سے کلکتہ میں وکلا کی جو فیس ادا کی جاتی ہے وہ انگلستان کی فیس سے سہ چند ہوتی ہے۔ ہندوستان کے لوگ انگریزوں کے مقابلہ میں اگرچہ بہت غریب ہیں تاہم جو تکلیف دہ تاخیر اور خرچ انگریزی قانون کی وجہ سے پیش آتا ہے وہ اس کو ان نقائص کے مقابلہ میں جو اس

قانون کے غیر ملکی ہونے کی وجہ سے اس میں موجود ہیں زیادہ اہم نہیں سمجھنے ان کی فطرت۔ ان کی عزت۔ ان کے مذہب ان کی عورتوں کی عفت کے قومی محسوسات کو اس بدعت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مال کی کارروائیوں میں پہلا قدم جو اٹھایا گیا وہ یہ تھا کہ مال گزاری کی بقایا میں لوگ گرفتار کیے جانے لگے۔ درانحالیکہ ایک معزز ہندوستانی کے لیے محض نظربندی نہ تھی بلکہ بدترین ذاتی بے عزتی تھی۔ ہر مقدمہ کی ہر منزل پر حلف لیے جانے لگے۔ درانحالیکہ معزز ہندوستانیوں کے نزدیک یورپ کے فرقے کویکر (QUAKER.) سے (جو قسم کو معیوب سمجھتا ہے) یہ طریقہ زیادہ تکلیف دہ تھا۔ مشرقی ممالک میں معزز گھروں کے زنان خانہ میں غیر آدمی کا داخل ہونا یا عورتوں کے چہرے کو دیکھ لینا ایسی ناقابل برداشت زیادتی سمجھی جاتی ہو اور اس کو موت سے بھی زیادہ خوفناک خیال کیا جاتا ہے اور جس کا انتقام صرف خونریزی سے لیا جا سکتا ہے۔ بنگال۔ بہار اور اڑیسہ کے نہایت معزز خاندانوں کو اس قسم کی بے عزتیوں کا سامنا ہوا۔ اگر ہمارے ملک میں دفعتاً ایک ایسا قانون نافذ کر دیا جائے جو ہمارے لیے ایسا ہی نیا ہو جیسا کہ ہمارا قانون ہماری ایشیائی رعایا کے لیے ہے تو یہ خیال کرنے کی بات ہو کہ ہمارے ملک کی اُس وقت کیا حالت ہو جائے گی۔ اگر ہمارے ملک میں یہ قانون نافذ ہو کہ کسی شخص کے یہ قسم کھا لینے سے کہ اس کا قرضہ ہم پر ہے اسے یہ حق ہو جائے گا کہ وہ معزز اور مقدس ترین اشخاص اور پردہ نشین خواتین کی ہتک کر سکے۔ ایک افسر کے بید لگائے جا سکیں ایک پادری کو کٹہرے

میں ٹھونکا جا سکے۔ شریف عورتوں کے ساتھ اس طریقہ سے سلوک کیا جا سکے کہ جس کا نتیجہ واٹ ٹائلر[1] جیسا بلوہ ہو تو اس وقت ملک کی جو حالت ہو جائیگی اس کا تصوّر کرنے سے دل کانپتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد حکومت میں سپریم کورٹ (عدالت العالیہ) نے جب اپنے قانون کو اپنے تمام مقبوضات ہند میں وسعت دینے کی کوشش کی تو قریب قریب اسی قسم کی کیفیت یہاں پیدا ہو گئی۔ اس سے ہراس و خوف کا عہد شروع ہو گیا۔ اور وہ خوف اس خیال سے کہ خدا جانے اس کی تہہ میں اور کیا کیا مصائب پوشیدہ ہیں بہت زیادہ ہو جاتا تھا۔ یعنی جو مصیبتیں لوگوں پر پڑ رہی تھیں وہ آیندہ پیش آنے والی مصیبتوں کے خوف کے مقابلہ میں کم تھیں۔ کوئی شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ عجیب و غریب عدالت آگے چل کر اور کیا رنگ لائے گی چونکہ ہندوستان کے لوگ سمندر کے نام سے ڈرتے تھے اس لیئے وہ خوف زدہ ہو کر کہتے تھے کہ یہ عدالت کالے پانی کے اُس پار سے آئی ہے اس عدالت کے ججوں میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا کہ وہ کروڑوں اشخاص کے رسم و رواج سے جن پر وہ بے قید حکومت کرتے تھے واقفیت رکھتا ہو مقدمات کی مسلیں اُس خط میں لکھی جاتی تھیں جس سے ہندوستانی

[1] انگلستان میں رچرڈ کے عہد حکومت سے قبل کاشتکاروں پر بہت سختیاں ہوتی تھیں ۱۳۸۱ء میں ہر بالغ مرد اور عورت پر ایک نیا ٹیکس لگایا گیا تھا جس کی مقدار ایک شلنگ فی کس تھی اس پر کاشتکاروں نے ایک عظیم الشان بلوہ کیا۔ اس بلوہ کا سرغنہ واٹ ٹائلر تھا۔ ۱۲

قطعاً ناواقف تھے اور فیصلے اُس زبان میں صادر کیئے جاتے تھے جس سے لوگ بالکل ناآشنا تھے۔ اِن عدالتوں کے گرد ہندوستانی آبادی کے بدترین لوگ جمع ہوگئے یہ لوگ چغل خور جھوٹے گواہ۔ مقدمہ ساز۔ دغاباز۔ اور سب سے بڑھ کر فرقی کرانے والوں کا وہ گروہ تھا جس کے مقابلہ میں انگلستان کے بدترین بنی باز نہایت دیانتدار اور نرم دل ...... معلوم ہوتے ہیں۔ . . . .

یہ انگریزی مشیران قانونی جس سرعت کے ساتھ تمام ملک میں پھیلے اُس سُرعت کے ساتھ حملہ آور بھی نہ پھیلے تھے۔ زمانہ سابق کے تمام ایشیائی اور یوروپین ظالموں کی غیرانصافیاں سپریم کورٹ (عدالت العالیہ) کے انصاف کے مقابلہ میں برکت معلوم ہوتی ہیں۔"

اس تحریر سے عیاں ہے کہ انگریزوں نے بجائے دیسی قانون کے انگلستان کا قانون جو خود انگلستان کے لوگوں کے نزدیک دیرطلب اور گراں تھا۔ ہندوستان میں ایک اجنبی زبان میں رائج کیا۔ مال گذاری وصول کرنے کے لیئے معزز لوگوں کی گرفتاری، حلف دینے کا طریقہ۔ پردہ نشین عورتوں کے گھروں میں سرکاری آدمیوں کا گھس جانا یہ سب چیزیں ایسی جاری کیں۔ جو اہلِ ہند کے لیے سخت ہیبت ناک تھیں اور حکام اور عدالتیں جن پر اہلِ ہند کے نزدیک خدا کا سایہ ہوتا۔ بقول لارڈ میکالے کے چغل خوروں جھوٹے گواہوں اور دغابازوں کا اڈّا بن گئیں۔

اِسی قسم کی خرابیوں کو دیکھکر سرہنری اسٹریچی صاحب جج۔ کلکتہ

ہائی کورٹ نے بعد کے زمانہ میں لکھا تھا کہ "ہندوستان جیسے آباد اور مہذب ملک میں انصاف اور معدلت کا نفاذ صرف اُسی ملک کے باشندوں کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے"۔

۱۸۳۰ء میں مسٹر ہولٹ مکنزی نے مال اور دیوانی کی یادداشتوں میں ایک جگہہ لکھا ہے کہ "یہ عمل نہایت حیرت انگیز ہے کہ ہندوستانیوں کے ساتھ ایسے نیک دل انگریزوں کا برتاؤ بھی حقارت آمیز رہا ہے۔ جو فی الواقع نہایت نیک نیت تھے کیونکہ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے۔ کسی حکومت کی مثال ایسی نہ ملے گی جس نے نہایت مکمل طور پر اپنے مطلق العنان جبروت کو سول انتظامات کے ذریعہ سے (اگر اس کو سول کہہ سکتے ہیں) منوایا ہو جو درحقیقت معناً حربی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے باشندگان ملک کو خود اُن کے معاملات کے طے کرنے میں اتنا اختیار بھی نہ دیا ہو جتنا کہ ایک معمولی سپاہی کو خود فوج کے انتظامات میں حاصل ہوتا ہے۔ یہ اصول ہر امر میں جاری و ساری ہے خواہ اُس کا تعلق وضع قوانین کے اعلیٰ ترین مناصب سے ہو یا کسی ادنیٰ ترین سرکاری عہدہ دار کے تقرر سے۔

اگر ہم ایک دفعہ بھی حکام سرکاری کو اس بات کی اجازت دے دیں یا ان کو اس پر مامور کر دیں کہ وہ لوگوں کے کاروبار کے ادنیٰ جزئیات میں ہمیشہ دخل دیا کریں تو پھر یہ توقع کرنا بالکل بے سود ہے کہ ہم کوئی قانون بنا کر بھی ان کی سخت گیری یا ایذا رسانی سے لوگوں کو مصئون یا مامون رکھ سکینگے لیکن بدقسمتی سے ہم نے بالکل برعکس اصول پر عمل کیا ہے ہم نے ہر چیز میں دخل اندازی کی ہے۔ جہاں کہیں مقبول عام انسٹی ٹیوشن تھے وہ ہمارے تغافل کے شکار ہوئے اور جہاں

ان کی ضرورت تھی ہم نے ان کے قیام کی کوشش نہیں کی۔"

۱۸۲۳ء میں سر طامس منرو نے یہ لکھا تھا کہ

"اگر برطانیہ کسی بیرونی سلطنت کا مفتوحہ ملک ہو جاتا اور اس کے باشندے اپنے ملک کے انتظامات سے خارج کر دیئے جاتے تو اُن کے تمام علوم اور تمام علم ادب خواہ وہ مذہبی ہو یا دنیوی انہیں ایک دو نسلوں کے بعد کمینہ چالاک، اور بے ایمان قوم ہو جانے سے نہ بچا سکتا تھا۔"

علی ہذا لارڈ لو نے اپنی کتاب برٹش انڈیا میں اس امر کی پیشین گوئی کی تھی کہ "انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کے فتح ہونے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ بجائے اُبھرنے کے اس کے تمام باشندے ذلیل ترین ہو جائیں گے"۔ اور واقعہ یہ ہے کہ لارڈ لو کی یہ پیشین گوئی لفظ بہ لفظ صحیح اُتری جس کی تصدیق سر طامس منرو نے ان الفاظ میں کی ہے کہ "انگریزی صوبجات کے رہنے والے فی الواقع ہندوستان میں حد سے زیادہ ذلیل اور کمینے ہیں۔

باب سوم

ایسٹ انڈیا کمپنی کا انتظامی دور

۱۲- کمپنی کے تجارتی دور کا خاتمہ | ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں تجارت

سلہ صفحہ ۱۱۶۔ دادا بھائی۔

کرنے کا فرمان ۱۳؍ دسمبر ۱۶۰۰ء کو عطا ہوا مگر کمپنی نے تجارت کرنے کے دوران میں ملک بھی حاصل کر لیا۔ اور اُن کا انتظامی دور دراصل ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی لڑائی کی فتح سے شروع ہوا اُس وقت سے وہ تاجر ہونے کے علاوہ ملک کے حکمران بھی ہو گئے۔ ۱۸۳۳ء میں جب کمپنی کی باضابطہ عملداری کو ۷۶ سال گزر چکے تھے سلطنت برطانیہ کو اس امر کا بخوبی اندازہ ہو گیا کہ تجارت اور حکومت دونوں کام ایک ہاتھ میں ہونے سے رعایا برباد ہوتی ہے۔ اس لیے سنہ مذکور میں کمپنی سے تجارتی حق لے لیا گیا اور اُسے صرف نظام حکومت ہند کا پٹہ ۲۰ سال کے لیے عطا کیا گیا۔ اسی کے ساتھ اس فرمان میں ہندوستانیوں کے مساوی حقوق ملازمت کو بھی حسب ذیل الفاظ میں تسلیم کیا گیا۔

"اور یہ قانون بنایا جاتا ہے کہ ممالک مذکور کے کسی باشندے کے لیے یا ملک معظم کی کسی رعیت کے لیے جو ممالک مذکور میں سکونت پذیر ہو، کمپنی کا کوئی عہدہ، کوئی خدمت اور کوئی ملازمت محض مذہب، جائے ولادت نسل یا رنگ کی بنا پر ممنوع نہ ہوگی۔"

۱۸۳۳ء کا فیاضانہ بل پاس ہونے کے وقت انگلستان کے مشہور فاضل لارڈ میکالے نے نہایت شاندار الفاظ میں خوشی اور فخر کا اظہار کیا۔ اور اشاعت تعلیم کی خوبیوں کی نسبت کہا کہ۔

"ممکن ہے کہ ہمارے نظام حکومت کے سایہ میں ہندوستان کی سیاسی ذہنیت اس قدر نشو و نما پا جائے کہ خود اس نظام کے اندر نہ سما سکے۔ ممکن ہے

کہ بہتر حکومت کے ذریعہ سے ہم اپنی رعایا میں بہتر حکومت کی صلاحیت پیدا کردیں اور مغربی علوم سے آشنا ہونے کے بعد کسی آئندہ عہد میں وہ مغربی اداروں کا مطالبہ کرنے لگیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ دن کبھی آئے گا یا نہ آئیگا لیکن میں اُس کو روکنے یا ٹالنے کی ہرگز کوشش نہ کروں گا۔ اور جب کبھی ایسا وقت آئے گا تو برطانیہ کی زندگی میں وہ سب سے زیادہ فخر و مباہات کا زمانہ ہوگا۔"

غرضکہ ان اُمید افزا شاہی اعلانات اور فصیح و بلیغ تقریروں کے ساتھ کمپنی کا خالص انتظامی دور شروع ہوا۔ مگر اُسی کے ساتھ شجر ہند کے تنہ میں کمپنی کے قرضہ کا گھن مستقل طور پر لگا دیا گیا اور عملاً یہ امر قرار دیا گیا کہ یہ قرضہ کبھی ادا نہ ہو۔ واضح ہو کہ ۱۸۳۳ء میں انگلستان کے قانون کی رو سے انتہائی شرح سود پانچ فی صدی تھی اور ہندوستان میں دام دوپٹ کا قانون رائج تھا جس کی رو سے دائن کو خواہ قرضہ پر سو برس کیوں نہ گزر جائیں اصل رقم قرضہ سے زیادہ سود نہ مل سکتا تھا مگر سلطنت برطانیہ نے کمپنی کے تمام تجارتی سرمایہ کی کثیر رقم پر برخلاف انگلستان اور ہندوستان کے رواج کے ۱۰½ فیصدی سود قرار دیا اور یہ طے کیا کہ چالیس سال یعنی ۱۸۷۴ء تک قرضہ نہ ادا کیا جائے بلکہ صرف سالانہ سود دیا جائے اور باوجود سال بہ سال سود دیتے رہنے کے ۱۸۷۴ء کے بعد ننانوے فی صدی زائد رقم دے کر قرضہ سے سبکدوشی حاصل کی جا سکے۔

ہر شخص، ہر ریاست، ہر سلطنت کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ قرضہ سے سبکدوشی حاصل کی جائے مگر کمپنی کا قرضہ وہ ہے جس کی ادائیگی عملاً ناممکنات سے ہے۔

کتنے نیک خیال وائسرائے ایسے آئے جنھوں نے ملک کے اخراجات میں تخفیف کرکے بجٹ بڑھائی۔ چنانچہ نیک دل وائسرائے سر ولیم بینٹنک نے جن کے زمانہ میں کمپنی سے تجارتی حق لے لیا گیا۔ ملک میں بے شمار اصلاحات اور تخفیفات کیں جو سب ولایتی مصارف (HOME CHARGES) کے نذر ہوئیں اور جس نسبت سے صاحب موصوف ہندوستان میں ہردلعزیز تھے۔ اسی نسبت سے انگلستان میں مطعون ہوئے۔

۱۳۔ جماعت ڈائرکٹران اور جماعت نگراں کار | بہرحال ۱۸۳۳ء کے قانون کی رو سے ہندوستان میں ایک جدید نظام قایم ہوا اور اُس کی ترکیب اس طرح تھی کہ کمپنی کے ۲۴ ڈائرکٹروں کے اوپر ایک جماعت نگران کار کے نام سے مقرر کی گئی تھی جس میں ڈائرکٹروں میں سے صرف ایک ممبر لیا جاتا تھا۔ اس نگراں جماعت کو صلح و جنگ کے اختیارات بھی تھے جس میں ڈائرکٹران کمپنی کو کوئی دخل بجز اس کے نہ تھا کہ خرچہ جنگ ادا کیا کریں۔ البتہ ڈائرکٹران مذکور کو دیسی ریاستوں پر کامل اختیارات حاصل تھے۔ چنانچہ بورڈ آف کنٹرول نے روس کی پیش قدمی کے اندیشہ سے افغانستان پر چڑھائیوں کا سلسلہ شروع کردیا۔ جس سے کروڑوں روپیہ کا قرضہ ہندوستان پر بڑھتا گیا۔ اور افغانستان کی چڑھائی کے سلسلہ میں وفادار امیر سندھ کو ہٹا کر سندھ پر قبضہ کرلیا۔

اب رہے ڈائرکٹران کمپنی اُن کے ہاتھوں سے تجارت نکل جانے کی وجہ سے یہ ضرور فائدہ ہوا کہ جو خاص مراعات برطانیہ کے تاجروں کو یہاں حاصل تھیں۔ اُن سے ڈائرکٹروں کو کوئی ہمدردی باقی نہ رہی تھی۔ اس لیے اُن تجاویز کی

جو تجارت میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کے یکساں حقوق کے متعلق تھیں ڈائرکٹران ساعی رہتے تھے یہ دوسری بات ہے کہ اُن تجاویز کو سکریٹری آف اسٹیٹ ہند انگلستان کے تاجروں کے دباؤ سے منظور نہ کریں۔ ایک عجیب لطیفہ یہ ہوا کہ انگلستان کے تاجر چاہتے تھے کہ ہندوستان سے اُنھیں ارزاں روئی ملے تاکہ وہ امریکہ سے روئی لینے پر مجبور نہ ہوں۔ اس لیئے وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان میں مالگذاری کی رقم کم کردی جائے۔ برخلاف اس کے ڈائرکٹران کمپنی کو چونکہ تجارت سے تعلق نہ رہا تھا اور مالگذاری کے اضافہ سے اُنھیں بجز نفع کے اور کچھ تعلق نہ تھا اس لیے وہ انگلستان کے تاجروں کی اس تجویز کے مخالف تھے۔

مگر تجارت نکل جانے کی کسر ایسٹ انڈیا کمپنی نے دوسرے طریقہ سے نکال لی اور وہ اس طرح کہ جن ریاستوں پر اُن کا قابو چلا اُنھیں اپنے قبضہ میں لے لیا ہندوستان میں زمانہائے قدیم سے لاولد اشخاص کو اختیار حاصل تھا کہ وہ کسی بچے کو متبنیٰ کرکے اُسے اپنا جانشین بنائیں مگر لارڈ ڈلہوزی نے متبنیٰ لڑکے کے حقوق کو ساقط کرکے تمام لاولد راجاؤں کی ریاستیں ضبط کرنی شروع کردیں۔ چنانچہ کچھ ریاستوں کو لاولد ہونے اور بعض کو بدنظمی وغیرہ کے الزام میں اپنے قبضہ میں کرلیا۔ اس طرح ریاست ہائے قرولی، ستارا، سمبلپور جھانسی، ناگپور، برار، اودھ وغیرہ پر جن کی تعداد لارڈ ڈلہوزی کے آٹھ سال کے زمانہ میں آٹھ تک پہونچ گئی تھی یکے بعد دیگرے ہاتھ صاف کیا گیا جس سے تمام ملک میں بے چینی اور بدخواہی کا تخم بویا گیا اور جس کا انجام یہ ہوا

کہ جھانسی کی وفادار رانی مردوں کی طرح انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء میں لڑی۔

۱۴- تجارت وصنعت کا خاتمہ | تجارت وصنعت چونکہ ایک دوسرے کو وابستہ ہیں اس لیے ان دونوں مسائل پر ہم یکجائی نظر ڈالنا چاہتے ہیں ۱۸۳۳ء میں جبکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حقوق تجارت واپس لے لیے گئے تھے اُس وقت کی صنعت وتجارت کے حالات کا اندازہ کرنے کے لیئے ہمیں اُس زمانہ کی رپورٹوں کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ یہ امر ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ۱۸۳۳ء کے بعد سے ہندوستان کی صنعت وتجارت کی ترقی کی طرف زیادہ توجہ ہوئی اور اُس کی وجہ یہ تھی کہ خود کمپنی کو تجارت کی اجازت باقی نہ رہی تھی اور اہل ہند میں تجارت وصنعت کی ترقی سے یہ امید ہوتی تھی کہ وہ دولتمند ہو کر کمپنی کو بہ حیثیت رعایا کے زیادہ روپیہ دے سکیں گے ان وجوہ سے کمپنی نے ہندوستان کی تجارت وصنعت کی دستگیری کا ارادہ کیا اور ۱۸۴۰ء میں پارلیمنٹ کے سامنے اس مضمون کی ایک درخواست پیش کی کہ ہندوستان کی صنعت پر جو تکلیف دہ محصولات عرصہ سے لگائے گئے ہیں اور جو اُس کو برباد کر رہے ہیں اُنھیں معاف کر دیا جائے چنانچہ اس امر کی تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ اس کمیٹی کے سامنے جو شہادتیں گزریں اُن سے اُن تمام طریقوں کا جو ہندوستان کی تجارت وصنعت کی بربادی کے موجب ہوئے انکشاف ہو گیا۔

ذیل میں ہم اُن شہادتوں کا جو کمیٹی مذکور کے سامنے گزریں خلاصہ

پیش کرتے ہیں:۔

مسٹر ٹربابو ہابین نے ۱۸۴۸ء میں ایک منتخب کمیٹی کے روبرو جو بیان دیا تھا اُس میں ہندوستان کی شکر سازی کے متعلق فرمایا تھا کہ "وسطی ایشیا کے لوگ بھی وادی گنگ کی شکر استعمال کرتے تھے، لیکن اُس وقت کی حالت کے بارے میں اُنھوں نے کہا تھا کہ "ہم نے اُن (ہندوستانیوں) کی صنعت و حرفت پر جھاڑو پھیر دی ہے۔ اب اُن کا سہارا صرف اُن کی ملکی پیداوار ہے اور میرے نزدیک ناانصافی ہوگی اگر اس پیداوار کو وطن کی منڈیوں میں مساوی مراعات نہ دی جایئں۔"[1]

مسٹر براکل ہرسٹ نے تسلیم کیا ہے کہ ۱۸۳۳ء میں جبکہ ہندوستان منتقل ہوکر گورنمنٹ کے انتظام میں پہونچا، تو پارچہ بافی کی صنعت برباد ہوچکی تھی۔!

مسٹر انیڈر یوسم نے اپنی شہادت میں کہا تھا کہ ہندوستانی جب اور پیشوں سے محروم کر دیے گئے تو" زراعت" کی طرف بالخصوص متوجہ ہونے لگے

مسٹر جے سی میلول[2] نے بیان کیا:۔

"برطانیہ کا سوتی اور ریشمی مال جو برطانیہ جہازوں کے ذریعہ سے ہندوستان کو جاتا ہے اس پر ۳½ فی صدی محصول لیا جاتا ہے اور اونی مال پر ۲ فیصدی لیکن ہندوستان کے سوتی مال پر جو انگلستان جاتا ہے دس فی صدی محصول لیا جاتا۔

---

[1] صفحہ ۱۱۳ دت جلد دوم

[2] صفحہ ۱۰۱ دت جلد دوم

اور ہندوستان کے بنے ہوئے ریشمی مال پر ۲۰ فی صدی اور اونی مال پر ۳۰ فی صدی۔

مسٹر جی جی ڈی ایچ لارنپٹ نے مسٹر شور کی شہادت سے حسب ذیل اقتباس پڑھکر سنایا:-

"انگریزی مصنوعات سے ہندوستانی صنعت کی شکست پا جانے کو اکثر برطانوی ہنرمندی کی فتح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ انگریزی مظالم کی ایک زبردست مثال ہے کہ انھوں نے نہایت تکلیف دہ طریقہ سے ہندوستانی مال پر محصولات لگا کر اپنے ملک کو صریحاً فائدہ پہونچانے کی غرض سے ہندوستان کو مفلس بنا دیا۔"

مسٹر لارنپٹ نے آگے چل کر کہا کہ ہم نے ہندوستانی صنعت کو برباد کر دیا اور جماعت ڈائرکٹران کی وہ رائے پڑھکر سنائی جو ولیم سٹبناک کی یادداشت میں درج تھی اور جو یہ ہے۔

جماعت[1] تاجران کی رپورٹ اس انقلاب کا جو ہندوستان کی تجارت میں واقع ہوا ہے اور جو ہندوستان کے بہت سے فرقوں کی موجودہ مصیبت کا باعث ہوا ہے اور جس کی نظیر دنیا کی تجارتی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ تاریک پہلو پیش کرتی ہے۔ اس رپورٹ[2] کے مطالعہ سے جماعت ڈائرکٹران کے دل میں حد درجہ کی ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ مسٹر مانٹ گومری مارٹین مولف تاریخ نوآبادی ہائے برطانیہ[3] کا بیان ہے کہ

---

[1] صفحہ ۱۰۸ ادت جلد دوم [2] صفحہ ۱۱۰ ادت جلد دوم [3] صفحہ ۱۱۲ ادت جلد دوم

"ہم نے ربع صدی کے دوران میں ہندوستانی علاقوں کو اپنے مصنوعات کے خریدنے پر مجبور کیا اس طریقہ پر کہ ہمارے ادنیٰ مال پر ہندوستان میں کوئی محصول نہیں لیا جاتا تھا۔ سوتی مال پر ۲½ فی صدی محصول تھا اور اسی نسبت سے دیگر اشیاء پر محصول لگایا گیا تھا۔ دراں حالیکہ اسی زمانہ میں ہندوستان کے بنے ہوئے مال پر ہم انگلستان میں ایسے سخت محصول لگاتے رہے کہ ہندوستانی مال کی درآمد بند ہو جائے بہ الفاظ دیگر اس محصول کی مختلف شرح ۱۰-۲۰-۳۰-۵۰-۱۰۰-۵۰۰ اور ۱۰۰۰ فی صدی تک اُن اشیاء پر لگائی گئی تھیں جو ہمارے ہندوستانی مقبوضات کی بنی ہوئی ہوں۔ اس لیے ہندوستان کے ساتھ آزاد تجارت کی چیخ پکار جو ہو رہی تھی وہ دراصل انگلستان کے مال کی آزاد تجارت تھی نہ کہ ہندوستان کے اس مال کی جو انگلستان بھیجا جائے۔ سورت۔ ڈھاکہ۔ مرشد آباد و دیگر مقامات کی جہاں دیسی صنعتیں عروج پر تھیں بربادی کی داستان بیان کرنا حد درجہ دلخراش ہے میری رائے میں یہ بربادی ایمان داری کے ساتھ تجارت کو ترقی دینے کی وجہ سے نہ تھی۔ بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ وہ ایک زبردست طاقت تھی جس کے ذریعہ کمزور کو دبایا جا رہا تھا۔"

مگر افسوس کہ بہی خواہان ہند کے اس طرح سے صدائے احتجاج بلند کرنے پر بھی گورنمنٹ کی پالیسی میں تبدیلی نہ کی جا سکی۔

سر چارلس ٹریویلین اُن نیک دل اصحاب میں سے تھے جنھوں نے غیر منصفانہ اور سخت ترین محصولات درآمد کے جس کی وجہ سے ہندوستانی مصنوعات کا انگلستان جانا بند ہو گیا تھا۔ خلاف آواز بلند کی اور جب وہ مدراس کے گورنر

مقرر ہوئے تو انھوں نے جدید محصولات کی مخالفت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۶۲ء میں اُن کو واپس بلا لیا گیا اور کم و بیش ایک سال کام کرنے کے بعد اُن کو گورنری کا عہدہ چھوڑنا پڑا صرف اس وجہ سے کہ انھوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ اس واقعہ سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ سر چارلس موصوف عملاً ملکہ معظمہ کے ماتحت نہ تھے جن کی طرف سے ۱۸۳۳ء و ۱۸۵۸ء میں یہ اعلانات ہو چکے تھے کہ تمام مذاہب اور اقوام کو انگریزی حکومت میں مساوات کا درجہ حاصل ہے بلکہ وہ ایک ایسی حکومت کے ملازم تھے جو برطانیہ عظمیٰ کی پارلیمنٹ کے ماتحت ہے اور یہ وہ پارلیمنٹ ہے جس پر وہاں کے صناعوں اور ووٹروں کا اثر اور اقتدار ہے۔

۱۵۔ زمینداروں کے اخراج کی پالیسی | یہ بالکل صحیح ہے کہ ۱۸۳۳ء میں اور اُس کے بعد زمینداروں کی سقیم حالت کی وجہ سے ڈائرکٹران ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے مالگزاری کو کم کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ مگر اسی کے ساتھ زمینداروں کو درمیان سے اُڑا دینے کی پالیسی جاری رہی۔ اس پالسی کی بنا پر ان کو آراضی سے جس کی مالک گورنمنٹ ہے کسی بڑے فائدے کے اُٹھانے کا حق نہیں ہے۔ لارڈ ڈلہوزی صاحب اس قسم کی رائے ہی نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ حقیقت میں اس پر عامل تھے اور جس قدر اُن کے امکان میں تھا زمینداروں کی بیخ کنی کرنے میں کوشاں تھے۔ صوبجات۔ مدراس۔ برہما۔ آسام اور احاطہ بمبئی کے بڑے حصہ میں وہ رعیت واڑی کا طریقہ جاری کرنے میں جو اب تک جاری ہے کامیاب ہوئے۔ سر جان لارنس نے بھی جو بعد کو وائسرائے ہوگئے تھے۔ لارڈ ڈلہوزی

کی اس پالیسی کی مندرجہ ذیل الفاظ میں تائید کی تھی۔

"درمیانی اشخاص کو جو ہر جگہ ملک کے لیئے لعنت ہیں نکال باہر کرو۔"

اس غرض کے لیئے یعنی زمینداروں کی قوت گھٹانے کے لیے پٹواریوں کو گانوں میں وہ اختیارات دیے گئے جو زمانہ سابق میں پنچائتوں کو حاصل تھے۔ مگر سر ہنری لارنس اس پالیسی کے خلاف تھے وہ زمینداروں اور گانوں کے مختلف طبقے کے سرداروں کی قوت بڑھانے کے حامی تھے۔ مگر وہ اِن اثرات کو جو لارڈ ڈلہوزی کی پالیسی نے پیدا کر دیئے تھے زائل نہ کر سکے اور زمینداروں کی بربادی کا کام بدستور جاری رہا۔

۱۶۔ کاشتکاروں کی بربادی | کاش زمینداروں کی بربادی سے کاشتکاروں کی حالت ہی بہتر ہو جاتی۔ تب بھی کچھ صبر آتا لیکن یہ بھی نہ ہوا۔ زمینداروں کے نکال باہر کر دیئے جانے سے کاشتکاروں پر سخت مصیبت نازل ہوگئی۔ جب گورنمنٹ کے گراں قدر مطالبہ جات کو کاشتکار آفات ارضی و سماوی کی وجہ سے پوری تعداد میں ادا نہ کر سکتے تھے۔ تو زمیندار اس کو ادا کر کے اُن کے اور گورنمنٹ کے درمیان حائل ہو کر اُن کے پشت پناہ بن جاتے تھے۔ زمینداران مطالبہ جات کو قرض دام لیکر اور اپنے سرمایہ کو کام میں لا کر ادا کر دیتے تھے لیکن کاشتکاروں کو یہ ذرائع میسر نہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ براہ راست گورنمنٹ کے زیر اقتدار ہو جانے سے کاشتکاروں کی حالت بد سے بدتر ہوگئی کیونکہ گورنمنٹ اپنی مضبوط طاقت کے زعم میں اُن کے ساتھ اس قسم کی نرمی برتنے کی طرف مائل نہ تھی۔ صوبہ مدراس میں گورنمنٹ زمینداروں کی بیخ کنی کرنے میں کامیاب ہوگئی لیکن

اپنے اس فعل سے اُس نے کاشتکاروں کو مطلق کوئی نفع نہ پہونچایا۔
سر[۱] فرانسس براؤن نے مدراس کے کاشتکاروں کی اس حالت پر حسب ذیل ریمارک دیا ہے۔

"مدراس کے کاشتکاروں کو سوا اس کے کہ وہ لگان ادا کرنے کے بعد اپنا پیٹ پال لیں اور کچھ مفاد حاصل نہیں ہوتا"

اس سلسلہ میں اُنھوں نے ذیل[۲] کے الفاظ میں ہندوستان کے باشندے کا نہایت دلچسپ سراپا کھینچا ہے:۔

"میری نگاہوں کو ہندوستانی کی جو وقعت ہمیشہ محسوس ہوتی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ وہ ایک ہستی ہے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کو روپیہ ادا کرنے کے لیے پیدا کی گئی ہے....
میرا منشاء ایسٹ انڈیا کمپنی کی تنقیص نہیں ہے مگر ملک میں یہ حالت موجود ہے اور میں صرف یہ التجا کرتا ہوں کہ ایک انگریز فہم اور دیانت کے ساتھ اس پر نظر ڈال لیجیے اور اس معیار سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو جانچیئے۔

میں بے شبہ کہتا ہوں کہ ظالم حکومت کے نیچے میں لوگوں کا جو حال ہوتا ہے، میں نے مالابار کے باشندوں کو اسی طرح افلاس اور موت کا شکار ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔
یہاں کی حکومت کا یہ اثر ہے کہ رعایا کنگال اور ذلیل و

---

[۱] صفحہ ۱۳۶ دت۔ [۲] صفحہ ۱۳۷ دت جلد ۱

خوار ہوتی جاتی ہے۔"

اسی طرح جان سلیوان نے جو مدراس کے بورڈ آف ریونیو کا صدر رہا تھا لکھا ہے:

"ہمارا طرز حکومت اسپنج سے بہت مشابہت رکھتا ہے وہ گنگا کے دھارے سے تمام نعمتیں چوس لیتا ہے اور ٹیمز کے کنارے پر نچوڑ دیتا ہے۔"

۱۷۔ ۱۸۳۳ء کے قانون سے کہاں تک اصلاح ہوئی؟

۱۸۳۳ء کے قانون سے یہ توقع کی گئی تھی کہ اس کی بدولت ہندوستان میں اہم اور مفید اصلاحات کا دور شروع ہوگا۔ لیکن اس کا نفاذ بعد از وقت ہوا اور کبھی بھی اس کو اس کے اصلی معنوں میں عمل میں نہیں لایا گیا۔ اس کے بہت سے احکام جہاں تک ان کا ہندوستانیوں کے حقوق سے تعلق تھا ہمیشہ لاعمل رہے۔ اس کا ناگزیر نتیجہ یہ ہوا کہ اصلاحات کی سب امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ۱۸۳۷ء میں سرجان شور نے جس کا تعلق بنگال سول سروس سے تھا اس قانون (۱۸۳۳ء) پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا۔

"لیکن ہندوستان کا عہد زریں گزر چکا ہے جو دولت کبھی اس کا جزو اعظم تھا ملک کے باہر کھینچ کر بھیج دیا گیا ہے اور اس کے قدرتی عمل اس بدعملی کے ناپاک نظام نے معطل کر دیئے ہیں جس نے لاکھوں نفوس کی منفعت کو چند افراد کے فائدے کی خاطر قربان کر دیا ہے......................

برطانیہ نے جو طرز حکومت قائم کیا ہے اس کے تحت میں ملک
اور باشندگان ملک رفتہ رفتہ محتاج ہوتے جاتے ہیں اور یہی
سبب ہے کہ ان (یعنی اپنے تاجروں) پر جابرانہ تباہی آ گئی۔ انگریزی
حکومت کے پیس ڈالنے والی زیادہ ستانی نے ملک اور اہل
ملک کو اتنا مفلس کر دیا ہے کہ اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ انگریزوں
کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ ہر صورت سے تمام ہندوستانی
قوم کو اپنی اغراض کا غلام بنا لیا جائے۔ اُن پر محصولات اتنے
لگا دیئے ہیں کہ اضافہ کی گنجایش نہیں رہی۔ یکے بعد دیگرے
جو صوبہ ہمارے تصرف میں آیا ہے اس کو مزید وصول یابی کا
میدان بنا لیا گیا ہے اور ہم نے اس بات پر ہمیشہ فخر کیا ہے کہ
دیسی والیان ملک جتنا وصول کرتے تھے اس سے ہماری آمدنی
کس قدر زیادہ ہے ہر وہ عہدہ۔ عزت اور منصب جس کو قبول کرنے
کے لیئے ادنیٰ سے ادنیٰ انگریز کو آمادہ کیا جا سکتا ہے ہندوستانیوں
کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ ہندوستان میں جتنی انتہائی
سخت اور جابر حکومتیں گزری ہیں ان میں ایک برطانوی حکومت
ہے جس کے دور میں حکومت اور ذی ثروت افراد (بشرطیکہ وہ
بے اندازہ دولت رکھتے ہوں) دونوں انصاف کا خون کر سکتے
ہیں اور کر چکے ہیں۔ جس کے عہد میں ظلم کی دادرسی تقریباً ایک
ناممکن چیز ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ رعایا ہم سے نفرت کرتی ہے

اور ہر طاقت کا خیر مقدم کرنے اور اس کے پرچم کے نیچے جمع ہوجانے کے لیے تیار رہے بشرطیکہ اس میں اتنی قدرت ہو کہ ہمیں تباہ کرسکے "

مسٹر سیلول میرٹ ممبر کونسل نے ۱۸۳۶ء میں لکھا:[1] —

" برطانیہ کا دورِ حکومت مہربان اور مقبول بتایا جاتا ہے مگر اس عہد میں ملک جس حالت کو پہونچ گیا ہے۔ اگر اس کا مقابلہ دیسی حکمرانوں کے عہد سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُس وقت لوگ خوش حال تھے...... یہ ملک فلاکت کی انتہائی پستی تک پہنچ گیا ہے۔ میں ایک واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں جو نہایت اہم نتائج سے لبریز ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ چند سال سے سرکاری مال گزاری کا بڑا حصہ ملک کا سرمایہ بک کر ادا ہو رہا ہے اگرچہ وہ سرمایہ خود ہی نہایت مختصر ہے۔ سرمایہ سے میری مراد کسانوں کی منقولہ جائداد ہے جو قیمتی دھات یا پتھر کے استعمالی زیورات پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان زیورات کو حسب ضرورت نفع آور کاموں میں لگا لیا جاتا ہے۔ اور کاشتکاری کے لوازمات کے بہم پہونچانے کا بھی اس سے کام لیا جاتا ہے اور بالعموم اس مقصد کے حاصل کرنے کو اُس وقت تک کے لیئے جب تک کہ کام پورا ہو گرو کرنے کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ جس چیز پر نظر ڈالیئے اس سے یہ عقیدہ کہ روز افزوں تنگ حالی ہم کو فلاکت مطلق کی طرف لیئے جارہی ہے

---

[1] صفحہ ۴۴ دادا بھائی

پختہ ہوجاتا ہے"

مسٹر ہیرٹ ایک دوسرے مقام پر کہتے ہیں:

"ہندوستان میں ہماری حکومت سے جو مصائب ظہور میں آئے ہیں وہ یا تو اُس گراں قدر خرچ سے براہ راست پیدا ہوئی ہیں جو یہ ملک انگلستان کو ادا کرتا ہے یا بالواسطہ اُسی کا نتیجہ ہیں"......

"یہ سچ ہے کہ کھلی ہوئی دست درازی کے استیصال سے جو برکات حاصل ہوتی ہیں اُن کے ہندوستانی اب تک ممنون اور معترف ہیں، مگر اسی کے ساتھ وہ کہتے ہیں کہ یہ بڑھی ہوئی ناداری ایک ایسے ناسور کا پتہ دیتی ہے جو درپردہ ہلاکت کے سامان کر رہا ہے اور اس کا کوئی جواب موجود نہیں ہے"

مسٹر ہیرٹ کی مندرجہ بالا یادداشت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہایت زور کے ساتھ گورنمنٹ کی مالگذاری کی سخت پالیسی کے مخالف تھے یہ پالیسی وہ پالیسی تھی جس کا نتیجہ فلاکت زدہ کاشتکاروں کے قلیل سرمایہ پر دست درازی ہوتی تھی اور وہ مجبور ہوتے تھے کہ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے زیورات کو سرکاری مطالبات کے ادا کرنے کی خاطر گرو کریں۔ یہ صورتِ حالات مسٹر ہیرٹ کے خیالات کو اُس وقت بھی صدمہ پہونچاتی تھی چہ جائے کہ موجودہ زمانہ میں یہ عمل وسط اُنیسویں صدی کی نسبت اب بہت زیادہ عام ہوگیا ہے۔ سرکاری خزانہ کا پیٹ بھرنے کے لیئے صرف کاشتکاروں کی چھوٹی چھوٹی اشیاء ہی مسلسل طور پر گرو اور فروخت نہیں ہوتیں بلکہ وہ اپنے ذمہ کا مطالبہ ادا کرنے کے لیئے بہت زیادہ تعداد میں اپنی زراعتی

آراضیاں بھی گاؤں کے بیوہرے کے پاس رہن کر دینے پر مجبور ہوتے ہیں خواہ یہ مطالبہ رعیت واڑی کے صوبجات میں مالگزاری کا ہو یا زمینداری کے حصہ ملک میں بڑھے ہوئے لگان کی صورت میں ہو جو بڑھتی ہوئی مالگزاری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ بات خدا کو معلوم ہے کہ اگر سر جان شور اور مسٹر ہیریٹ بیسویں صدی میں موجودہ صورت حالات دیکھنے کو زندہ رہتے تو وہ اُس کی نسبت کیسے زیادہ سخت الفاظ استعمال کرتے۔

۱۸۔ ہندوستانی باوجود مسلمہ قابلیت کے بڑے بڑے عہدوں سے محروم رہے

سر ولیم بنٹنک جو ہندوستانیوں کے بڑے ہی خواہ تھے۔ انہیں ہندوستانیوں کو بڑے بڑے انتظامی عہدے دینے کی طرف خاص توجہ تھی۔ لیکن باوجود اپنی اس خواہش کے ان کو اس مضبوط رائے کے سامنے جو اُس وقت سرکاری حلقوں میں ہندوستانیوں کے خلاف جاری و ساری تھی سر تسلیم خم کرنا پڑا اور بڑے سے بڑا عہدہ جو وہ اپنے زمانہ میں ہندوستانیوں کو دے سکے وہ منصفی یا صدر امانت کا تھا۔ ۱۸۳۳ء کے شاہی اعلان کے بموجب سرکاری ملازمتوں میں گورے اور کالے کا اختلاف موقوف کر دیا گیا تو یہ توقع کی گئی تھی کہ گوروں اور کالوں سب کو ان کی قابلیت کے موافق جلد از جلد اعلیٰ عہدے دیئے جانے لگیں گے لیکن ۲۰ سال تک اس بارہ میں کوئی عمل نہیں کیا گیا۔ بعض لوگوں کو یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ غالباً ہندوستانی اپنی عدم قابلیت کی وجہ سے ان عہدوں پر فائز ہونے سے محروم رکھے گئے ہیں۔ اس امر کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن بیٹھا۔ اس کے سامنے جو شہادت ہوئی اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعلیٰ عہدوں میں ہندوستانیوں کی

عدم موجودگی میں نہ تو قابلیت کا سوال حائل تھا اور نہ صرفہ کا۔ فی الواقع
ہندوستانیوں کی قابلیت بعض اوقات انگریزوں کی قابلیت سے بالاتر تھی۔
اوران کی خدمات کا معاوضہ اس سے جو اسی قابلیت کے انگریزوں کو دیا جاتا
تھا کہیں کم تھا۔ اس قدر قابل اور ویسی اشخاص کی خدمات سے فائدہ نہ اٹھائے
جانے کا سبب غالباً ان کا سیاہ رنگ تھا اور یہ کہ وہ محکوم قوم سے تعلق
رکھتے تھے۔

سرارسکن پیری نے جنہوں نے اس تحقیقات میں شہادت دی[۲] دو کامیاب
بیرسٹروں کا جو ہندوستان میں وکالت کرتے تھے ایک قول نقل کیا ہے اور
خود اس کی تائید کی ہے وہ لکھتا ہے کہ "ہندوستانی مجوزین کی قوت فیصلہ کمپنی
کے ان ججوں سے جو اپیل سنتے تھے بدرجہا بہتر تھی" (ص ۱۹۳ - و ت)

مگر اب سوال یہ ہے کہ قابل ترین ہندوستانی ججوں کو اس زمانہ میں
بمقابلہ انگریز ججوں کے کیا تنخواہ ملتی تھی اس کے جواب میں سرارسکن پیری
کہتا ہے کہ "یوروپین جج کو تقریباً تین ہزار پونڈ سالانہ تنخواہ ملتی ہے۔ لیکن
ہندوستانی منصف صرف ۱۲۰ پونڈ سالانہ پاتا ہے"

اس حساب سے ہندوستانی ججوں کو جن کی قوت فیصلہ بدرجہا بہتر تھی جو معاوضہ
ملتا تھا وہ اس تنخواہ کا پچیسواں حصہ ہوتا تھا جو یورپین ججوں کو دی جاتی تھی۔

اسی طرح جان سلیور نے جو مدراس گورنمنٹ کا ممبر رہا تھا کہا تھا :-
"وہ لوگ (باشندگان ہند) اور ٹیکسوں کے لگانے میں جن کی ادائگی
کے لیئے وہ مجبور کیئے جاتے ہیں کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ قوانین کو

جن کی تعمیل ان پر فرض ہوتی ہے مرتب کرنے میں ان کی
کوئی آواز نہیں ہوتی ۔ ۔ اپنے ملک کے انتظام میں انکا
کوئی حقیقی حصہ نہیں ہوتا۔ اور ان حقوق کے دیئے جانے سے
اس شرمناک حیلہ سے انکار کیا جاتا ہے کہ ان میں اس قسم کے
فرائض کے انجام دینے کے لیئے ذہنی اور اخلاقی اوصاف کی
کمی ہے" (رپورٹ سلیکٹ کمیٹی صفحہ ۴۰۲ - دت جلد ۲)

مذکورہ بالا حالات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاہی اعلان ۱۸۳۳ء کے احکام کی
تعمیل اس زمانہ کی گورنمنٹ کہاں تک کرتی تھی۔

باب چہارم

ہنگامہ ۱۸۵۷ء اور مابعد

۱۹۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء | ۱۸۵۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں آئے ہوئے
۱۵۰ سال اور کمپنی کی عملداری کو پورے ایک سو سال ہو چکے تھے اس عرصہ
میں ہندوستان کی تجارت وصنعت ختم ہوگئی کاشتکار قرضہ لیکر لگان اداکرنے
پر مجبور ہوگئے زمیندار بے دست وپا اور ملازمت پیشہ لوگ بڑے عہدوں سے
قطعاً محروم ہوگئے ، دیہات اور مفصلات کی پنچایتیں ٹوٹ کر اُن کی جگہ صدر
مقامات میں عدالتیں قائم ہوگئیں ۔ جہاں انصاف بغیر روپیہ صرف کیے حاصل

نہ ہوسکتا تھا۔ اودھ جس کا ۱۸۵۶ء تک الحاق نہ ہوا تھا وہاں کے لوگوں کی نسبت تحریر ہے کہ" وہ انگریزوں کی اس پالیسی کی نسبت عجیب و غریب افواہیں سُنا کرتے تھے۔ عدالتوں کے طرزِ عمل، ذی حیثیت خاندانوں اور قوم کے سرداروں کی بربادی اور اُن کی جائدادیں نکلنے کے قصے سُنتے تھے جن کی تباہی و بربادی کچھ تو اس وجہ سے تھی کہ برسرِ اقتدار حکام اصولاً اُن کے مخالف تھے اور کچھ اس وجہ سے کہ عدالتوں کی کارروائیاں پیچیدہ ہوگئی تھیں اور عیار اور چالاک سود خوار اشخاص زور پکڑ گئے تھے۔ ان باتوں سے اودھ کے لوگ سمجھتے تھے کہ ایسے دشمنوں کے سامنے وہ بالکل بے دست و پا ہو جائیں گے"

(از رسالہ بغاوت افواج مصنفہ لفٹنٹ جنرل میک لیوڈ اینس مطبوعہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۳۰)

مصنف مذکور نے دیسی ریاستوں کا الحاق ہوجانے کے بعد اُن پر جو اثر پڑا اُس کی نسبت لکھا ہے :-

" لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل کی سات سال کی حکومت کے زمانہ میں انگریزی عملداری کی حدود سمندر سے لیکر پہاڑوں تک وسیع ہوگئیں۔ اس طرح پر کہ بعض علاقے مثل پنجاب کے فتح کئے گئے، بعض صوبے ایسے تھے جو مثل اودھ کے انگریزی سلطنت کے یار و مددگار تھے اُن پر زبردستی قبضہ کیا گیا، اور بعض ریاستیں مثل جھانسی کے ایسی تھیں جنھوں نے سلطنت برطانیہ کی اطاعت قبول کرلی تھی مگر وہ بھی لے لی گئیں۔ اس طرزِ عمل سے اہلِ ہند یہ سمجھنے لگے کہ انگریزوں کی حرص ایسی ہے کہ وہ کبھی پوری نہیں ہوسکتی" (صفحہ ۱۱ و ۱۲)

بغاوت افواج۔

اسی بارہ میں مصنف مذکور نے تحریر کیا ہے کہ "جن لاولد رئیسوں نے لڑکوں کو گود لیکر اپنا ولی عہد بنالیا تھا اور انگریزوں نے اُن کا ولیعہد ہونا تسلیم نہیں کیا۔ اُن رئیسوں کو سلطنت سے عداوت قائم ہوگئی اور اس عداوت کے اثرات ملک میں پھیل گئے۔ پھر اودھ کا الحاق ہوا جس کا انتظام عمدہ تھا مگر بعد میں خراب ہوگیا تھا۔ یہ علاقہ سپاہیوں کی کثیر تعداد کا وطن تھا۔ اور اس کے تعلقات انگریزوں سے دوستانہ تھے مگر اُس کے الحاق ہوجانے سے وہاں کے لوگوں کو انگریزوں سے ہمدردی باقی نہیں رہی۔ اس کے بعد بھرتی کا قانون پاس ہوا جس سے فوج کے لوگوں کی وفاداری میں خلل آگیا۔ اور انجام کار جنوری ۱۸۵۷ء میں چربی کے کارتوسوں کا واقعہ پیش آیا جس سے ہنگامہ ہوا" (صفحہ ۲۸۷ - ۲۸۸ رسالہ مذکور

اسی رسالہ میں لفٹنٹ جنرل میک لیوڈ اینس نے لکھا ہے کہ

"ایک اور جماعت تھی جو انگریزی عملداری سے نالاں تھی۔ یہ جماعت یا تو ریاستوں کے الحاق سے ناراض تھی یا آراضی کے محاصل کے بارہ میں انگریزوں کی پالیسی سے بددل تھی" (صفحہ ۸) اس قسم کے بہت سے امور مل کر اُس ہنگامہ کے موجب ہوئے جس کا اندیشہ دور بیں انگریزوں کو عرصہ سے تھا۔ اس ہنگامہ کی نسبت مسٹر لیکی نے حسب ذیل الفاظ میں اپنا خیال ظاہر کیا ہے "اگر دنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب کہی جاسکتی ہے تو وہ ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کی بغاوت تھی"

انگریزی کی ایک مثل مشہور ہے کہ کالے بادلوں میں بھی نقرئی دھاریاں ہوتی ہیں۔ اسی طرح غدر کی بربادی میں بھی کچھ نہ کچھ خوبیاں مضمر تھیں۔ اس ہولناک واقعہ نے انگریزوں کی آنکھیں کھول دیں اور انہیں یہ معلوم ہوگیا کہ فطرت انسانی سب چیزوں پر غالب رہتی ہے۔ اس لیے جن لوگوں کو کچھ اختیارات دیے جائیں اُن پر کچھ قیود بھی عائد ہونی چاہئیں۔ اُنھوں نے ایک سبق یہ سیکھا کہ اگر انھیں اس وسیع سلطنت سے کچھ نفع اُٹھانا ہے تو بہتر طریقوں سے اُس پر حکومت کرنی چاہیئے۔ اس غدر کے واقعہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو سخت دھکا لگا اور حضور ملکہ معظمہ قیصر ہند نے اُس کے طرز حکومت کے نقائص کو محسوس کرکے اُس کے اختیارات کا یکسر سلب کرلیے۔ اور ہندوستان کی زمام حکومت براہ راست اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ اور ۱۸۵۸ء میں جو اعلان انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان مساوات اور برابری قائم کرنے کے متعلق شائع کیا وہ ۱۸۳۳ء کے اعلان سے بھی زیادہ دل خوش کن اور دلفریب تھا حکومت کی اس تبدیلی سے عام طور پر بڑی خوشیاں منائی گئیں اور آیندہ طرز حکومت کے متعلق پروگرام بنائے گئے جن کا پتہ اُس زمانہ کی تحریرات سے چلتا ہے۔

۲۰- لوٹ مار اور تجارت | ایسٹ انڈیا کمپنی کا ظاہری مقصد ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ بتدریج اس کی فوجی اور سیاسی قوت بڑھ گئی تجارتی کاروبار لوٹ کی صورت میں منتقل ہوگیا مسٹر جان برائٹ نے ۱۸۵۸ء میں ہاؤس آف کامنس (دارالعوام) میں تقریر کرتے ہوئے

کمپنی کے اس قسم کے معاملات کی صورت حال پر حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"آیندہ ہندوستان میں ہماری حکومت کا مقصد یہ نہ ہونا چاہیئے کہ چند انگریزوں کو یا سول سروس کے عہدہ داروں کو نفع پہونچائیں جن کی شان میں اس مجلس میں مسلسل قصیدہ خوانی ہوتی رہتی ہے۔ ہاں اگر ہندوستان کی حکومت کا منشا انگلستان کو فائدہ پہونچانا ہو تو آپ حق پر ہوں گے۔ لیکن انگلستان کو یہ فائدہ ہندوستان کے فائدے کی وساطت سے حاصل ہونا چاہیئے۔
ہندوستان کی حکمرانی سے اگر ہم کچھ تمتع چاہتے ہیں تو اس کی صرف دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ہندوستانیوں کو لوٹ لیا جائے اور دوسری یہ کہ اُن کے ساتھ تجارت کی جائے۔ لیکن ہندوستان کے ساتھ تجارت کر کے انگلستان دولتمند بننا چاہتا ہے تو یہ شرط ہے کہ خود ہندوستان کو دولتمند ہونا چاہیئے۔" (ص ۲۷۹ دادا بھائی)۔

سر جان لارنس نے ۱۸۶۴ء میں کہا تھا کہ "مجموعی حیثیت سے ہندوستان بہت مفلس ملک ہے۔ جہاں عام لوگوں کو بہت ہی قلیل معاش میسر آتی ہے۔"

سر جان ونگیٹ نے جن الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اُس سے اُن کی کمال درجہ خدا پرستی عیاں ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"اب اگر یہ واقعہ ہے کہ ہم نے ہندوستان پر صرف وہاں کے باشندوں کے فائدے کے لیئے نہیں بلکہ اپنی اغراض کی خاطر حکمرانی کی ہے تو ہم خدا کی اور دنیا کی نگاہوں میں یکساں طور پر ایک صریح جرم کے مرتکب ہوئے ہیں

کیونکہ اس حکمرانی کے مصارف میں اپنی گرہ سے ہم نے کوڑی خرچ نہیں کی ہم
ہمیں لازم تھا کہ اپنا صحیح رسدی حصہ خواہ وہ تھوڑا ہوتا یا بہت ادا کر دیتے
اور اس امر کا اندازہ کہ ہمارا حصہ کس قدر ہونا چاہیئے تھا اس طرح ممکن تھا کہ جس
حد تک برطانوی اغراض نے ہماری ہندی پالیسی کو اپنا تابع رکھا ہے اس پر نظر
کر لی جاتی۔ مگر یہ دین ہم نے کبھی ادا نہیں کیا۔ چنانچہ اس وقت ہمارے ذمہ
قرضے کا ایک بارِ عظیم موجود ہے جو کئی سال سے اکٹھا ہوتا چلا آتا ہے۔ اور جس کا
چکانا ہمیں لازم ہے۔ انگلستان زبردست تھا اور ہندوستان اس کے قدموں
پر سرنگوں۔ ایسی صورت میں کمزور کو کب یہ موقعہ تھا کہ زبردست سے جبراً ادائگی
کرا سکتا۔

"محاصل جو اسی ملک سے وصول کئے جائیں اور وہیں صرف ہوں باعتبار
نتائج کے اُن محاصل سے یکسر مختلف ہوتے ہیں جو ایک ملک سے وصول کئے
جاتے ہیں اور دوسرے ملک میں صرف ہوتے ہیں ....
دوسرے ملک کو بھیج دینا اور ساری رقم کو سمندر کی نذر کر دینا یکساں بات ہے۔
اور واحد نتیجہ رکھتی ہے ....

...... یہی نوعیت اُس خراج کی ہے جو ہم اتنی مدت سے ہندوستان
سے وصول کر رہے ہیں۔ ہندوستانی خراج کو خواہ عدل کی میزان میں تو لیئے
یا ہماری حقیقی منفعت کے نقطۂ نظر سے دیکھیئے بہر حال آپ اس نتیجہ پر پہونچیں گے
کہ وہ انسانیت اور عقل کے خلاف ہے اور اقتصادیات کے مسلمہ کلیات کے
منافی ہے۔ پس سچی دانائی یہ ہے کہ آیندہ سے حکومت ہند کے "ولایتی مصارف"

جن کی شکل میں یہ خراج لیا جاتا ہے، برطانیہ کے خزانہ سے ادا کیے جائیں اِن مصارف کی اگر تشریح کی جائے تو غالباً ذیل کی مدات اُن میں شامل ہوں گی وہ منافع جو ایسٹ انڈیا اسٹاک کے مالکان کو تقسیم ہوتا ہے۔ وہ سود جو وطن کے قرضہ پر ادا کیا جاتا ہے۔ اُن عہدہ داروں اور ملازموں کے مشاہرے اور اُن عمارات کا خرچہ جو حکومت ہند کے ولایتی محکمہ سے متعلق ہیں وہ رقوم جو ہندوستان کے فوجی اور سول عہدہ داروں کو ولایت آنے کے بعد فرلو یا پنیشن کے زمانہ میں دی جاتی ہیں۔ مختلف قسم کے وہ تمام اخراجات جو ہندوستان میں رہنے والی برطانوی سپاہ کے سلسلہ میں ولایت میں کئے جاتے ہیں۔ اور اُن مصارف کا ایک جزو جو برطانوی سپاہ کو ملک ہندوستان لے جانے اور وہاں سے لانے میں برداشت کرنا پڑتے ہیں اگر ہندوستان کو اس خراج کے بار گراں سے سبکدوش کر دیا جائے اور ہندوستانی محاصل سب وہیں کے وہیں صرف ہوں تو وہاں کی آمدنی میں وہ برکت ہونے لگے جس کا اس وقت وہم وگمان بھی نہیں ہو سکتا۔" (آور فنانشل ریلیشنز ودھ انڈیا مصنفہ فنگبٹ)

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے کہ اُس وقت بھی جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عمل نے تجارت سے ہٹکر حکومت کی صورت اختیار کر لی تھی اس کے قدیم تجارتی رجحان میں کسی طرح کمی نہ آئی تھی بلکہ برخلاف اس کے اس میں بہت کچھ ترقی ہو گئی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا جو سرمایہ ہندوستان میں لگا ہوا تھا قدرتی طور پر اُس سے نفع اور نقصان دونوں وابستہ تھے۔ مگر ہندوستان کی

مالی حالت اور یہاں کی دولت کا زوال دیکھتے ہوئے زیادہ تر نقصان ہی کا اندیشہ تھا۔ باضابطہ حکومت کی شکل اختیار کرنے پر اسی سرمایہ کو ہندوستان کے ذمہ قرار دے کر اس پر ایسی شرح سود قائم کر دی گئی جو مستقل طور پر کسی تجارت میں بھی ادا نہیں کی جا سکتی اور اس طرح سے اس سرمایہ کو دوامی طور پر نفع آور بنا دیا گیا۔ اور اسی پر بس نہیں کیا گیا۔ کمپنی کے بڑے بڑے تنخواہ دار ملازمان کی تنخواہوں کا بار ہندوستان پر ڈالا جاتا تھا نہ صرف ان کا جو ہندوستان میں ملازمت کرتے تھے بلکہ جو ملازم انگلستان میں رہتے تھے ان کی تنخواہوں کا بار بھی ہندوستان ہی پر تھا۔ گورنمنٹ کے ہوم ڈیپارٹمنٹ کے متعلق جو عمارات تعمیر ہوتی تھیں اس کے مصارف بھی ہندوستان ہی کو ادا کرنے پڑتے تھے اور آگے چل کر اُن لڑائیوں کے اخراجات جو انگریز آقاؤں کے زیر ہدایت لڑی جاتی تھیں ہندوستان کو برداشت کرنے ہوتے تھے۔ اور مزید برآں تجارت کے ذریعہ سے وہ بدستور برطانوی سرمایہ داروں کی دست برد کا شکار رہتا ہوا تھا۔ خلاصہ یہ کہ کمپنی کے دائرہ عمل میں تبدیلی ہو جانے سے ہندوستان کی مصیبت میں کسی قسم کی کمی ہونے کے بجائے اس کے شانوں پر اور زیادہ بھاری بار رکھ دیا گیا۔

۱۲۔ نظام سلطنت سے ہندوستانیوں کو خارج کرنے کا نتیجہ | غدر کے بعد بہت سے انگریزوں کی یہ رائے تھی کہ مثل مشرقی سلطنتوں کے انگریزوں کو بھی چاہیئے کہ ہندوستان کا انتظام ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیں جیسا کہ حسب ذیل اقوال سے ظاہر ہوگا:۔

لارڈ سیلسبری نے ۱۸۶۷ء میں کہا تھا:

"فی الحال میرے نزدیک یہ ممکن نہیں ہے کہ ہندوستان کے جو حصص ہمارے زیرنگیں ہیں وہاں کے سرکاری عہدوں پر زیادہ تر ہندوستانیوں کو ممتاز کیا جائے۔ لیکن ہمارے تسلط کا اثر اگر یہ ہوا کہ ہندوستان کے وہ باشندے جو حکمرانی کی اہلیت رکھتے ہیں ان مواقع سے ہمیشہ کے لیے قطعی محروم ہو گئے تو یہ ایک نقصانِ عظیم ہوگا۔ دیسی ریاستوں سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ جس مدبرانہ اہلیت کا میں ذکر کر چکا ہوں اس کے استعمال کا ایک محل موجود رہتا ہے میرے معزز دوست نے جس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے اس پر زیادہ بحث کرنا ضروری نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ عمدہ نظم ونسق رکھنے والی دیسی ریاست ایک حقیقی نیضان ہے۔ صرف اس لیے نہیں کہ وہ ہماری طرزِ حکومت کا ثمر ہے، بلکہ اور وجوہ سے قطع نظر کر کے، محض اس لیے کہ وہ ہندوستانیوں کے احساسِ خودداری کو ترقی دیتی ہے اور ایک نصب العین پیش کرتی ہے جو اہلِ قوم کے حوصلوں کا کعبۂ مقصود بن سکتا ہے۔" (ص ۶۱۸ دادا بھائی)

لارڈ لڈسلے نے ۱۸۶۷ء میں بیان کیا تھا کہ "ہمیں دیسی حکومت کے طریقہ کو جہاں تک ممکن ہو ترقی دینے کی کوشش کرنا چاہیے تاکہ دیسیوں کی قدرتی استعداد اور تدبّر کی نشو ونما ہو سکے اور اُن میں خفیہ خوبیاں اور جوہر کبھی تھے حکومت کی امداد میں کام آ سکیں۔ مغلیہ سلطنت کی عظمت کا راز وہ وسیع چشم حکمتِ عملی تھی جو اکبر اور اُس کے جانشینوں کا شعار رہی۔

جنھوں نے ہندوؤں کی اعانت اور قابلیت سے فائدہ اُٹھایا۔ اور حتی المقدور خود کو اہلِ ملک کے ساتھ یک ذات کر لیا۔ ہمیں ان واقعات سے سبق لینا چاہیئے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اُس فرض کو ادا کریں جو ہندوستان کی طرف سے ہم پر عائد ہے تو ہم اسی طرح سبکدوش ہو سکتے ہیں کہ ملک میں جتنے اشراف اور اکابر ہیں اُن کی امداد اور مشورہ سے فائدہ اُٹھائیں۔ یہ جواب کہ ہندوستانی دماغ میں تدبر اور قابلیت کا سرمایہ ناکافی ہے ایک بے معنی لغویت ہے“

لارڈ سیلسبری نے لارڈ ناڈ سلے کی تائید کرتے ہوئے فرمایا:-

”جو لوگ ہندوستان سے سب سے زیادہ واقف ہیں اُن کی متفقہ رائے یہ ہے کہ چند چھوٹی چھوٹی دیسی ریاستیں جن کا نظم و نسق عمدہ ہو ـــ ہندوستانیوں کے سیاسی اور اخلاقی ارتقار کے لیے حد درجہ مفید ہیں“

(ہینسرڈ جلد ۱۸۷ صفحہ ۱۰۷۳)

”باوجودیکہ انگریزوں کی عام رائے اُس زمانہ میں اسی طرف تھی کہ ہندوستان کا نظام اُسی پُرانے طریقے پر رکھا جائے جیسا کہ قدیم سے چلا آتا تھا تاہم ہندوستان میں وہی نظام قائم رکھا گیا جو کمپنی کے زمانہ میں قائم ہو چکا تھا اور جس کی نسبت لارڈ سیلسبری نے ۱۸۶۷ء میں فرمایا تھا کہ“ ضابطے اور دستور کی طرف برطانوی حکومت کا رجحان، اُس کی سُست گوش اور ابلہانہ لاپروائی جو اکثر اُس کی مکمل اور پیچیدہ تنظیم کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ذمہ داری کا خوف، اور اختیاراتِ نظم و نسق کا ایک جگہہ مرکوز ہونا، یہ سب باتیں ایسے

اسباب کا نتیجہ ہیں جن کی ذمہ داری کسی شخص پر نہیں ہے لیکن ان کی بدولت حکومت ناکارہ ہوگئی ہے اور اس نا اہلیت میں قدرتی حالات اور اسباب سے مزید اضافہ ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اک خوفناک تباہی نمودار ہوگئی ہے۔"

(ہینسرڈ جلد ۱۸۷ صفحہ ۱۰۷۳)

چنانچہ اس نظام کی وجہ سے جو مصیبت اس ملک میں ہوئی اُس کا اندازہ مسٹر رابرٹ نائٹ کی حسب ذیل رائے سے بخوبی ہو سکتا ہے جو اُنھوں نے "زوال گجرات" کی نسبت ظاہر کی ہے:-

"۱۸۵۰ء میں جب کہ گجرات میں ہم نے پہلا قدم رکھا تھا۔ بہت سے دولت والے اور فارغ البال خاندان موجود تھے۔ مگر ان کے بدن پر آج کپڑا بھی نہیں ہے .... تعلقہ داران سے ہمارے مطالبہ جات اُس رقم سے جو وہ پہلے ادا کرتے تھے تین گنے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں اور اس زیادتی کے معاوضہ میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ جو اُن کو حاصل ہوا ہو۔ ساہوکاروں نے جن سے تعلقہ داران کو تباہ کن شرح سود پر قرضے لینا پڑے ہیں اپنے مطالبے میں اُن کی املاک اور دیہات کو قرق کرا لیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ قرضہ سر سے اونچا ہوتا جاتا ہے اور گلوخلاصی کی صورت نہیں۔ خیال تو کیجیے کہ اُن کے گھرانوں کا آیندہ کیا حال ہوگا۔" (صفحہ ۴۶ دادا بھائی)

اسی طرح مسٹر گرانٹ ڈف نے مئی ۱۸۶۸ء میں مسٹر لین سن سے غریب ہندوستانیوں کے متعلق دارالعوام میں سوال کیا تھا کہ آپ کا کیا ارادہ

ہے کہ اک مفلس قوم کو بالکل ہی پیس ڈالا جائے (ص ۱۵ دادا بھائی)
اور لارڈ میو نے لیجس لیٹو کونسل میں تقریر کرتے ہوئے ۱۸۷۱ء
میں کہا تھا:-

"میں اعتراف کرتا ہوں کہ ہندوستان کا مقابلہ مساوی وسعت اور حیثیت کے ممالک سے کیا جائے تو یہ ملک نسبتاً مفلس نظر آتا ہے اور میرا عقیدہ ہے کہ اس ملک پر ایسے بار ڈالنا جو تکلیف دہ اور ناقابل برداشت ہوں انصاف اور مصلحت دونوں کے خلاف ہے" (ص ۱۵ دادا بھائی)

مسٹر گرانٹ ڈف نے دارالعوام میں بیان کیا تھا:-
"انگلستان میں لوگ مقابلتہً دولتمند ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ برطانیہ عظمیٰ کی آمدنی کا اندازہ اسی کروڑ پونڈ سالانہ کیا جاتا ہے اور برطانوی ہند کی آمدنی کا اندازہ تیس کروڑ پونڈ سالانہ ہے۔

چنانچہ اس حساب سے برطانیہ عظمیٰ میں اوسط آمدنی فی کس تیس پونڈ سالانہ ہوتی ہے اور برطانوی ہند میں دو پونڈ (ص ۱۵۔ دادا بھائی۔)

اس تحریر سے ظاہر ہے کہ ۱۸۷۱ء میں خود انگریزوں کے حساب سے ہندوستان کی فی کس آمدنی انگلستان کے مقابلہ میں پندرھواں حصہ رہ گئی حالانکہ یہ وہی ہندوستان تھا جس کی نسبت کمپنی کی عملداری کے شروع میں لارڈ کلایو نے کہا تھا کہ یہ "نا متناہی دولت والا ملک" ہے اور جس کو لارڈ میکالے نے "باغ ارم" تسلیم کیا تھا مگر باوجود اس قدر روز افزوں تنزل کے احساس کے کوئی بہتر کی تدبیر اختیار نہیں کی گئی تھی کہ ۱۸۷۳ء میں صوبجات

متوسط کے مسٹر ڈبلوجی پیڈر کو کہنا پڑا ''ایک ایسی رائے جس پر تقریباً ہر شخص متفق ہے۔ اگر قابل اعتماد ہو سکتی ہے تو یہ صحیح ہے کہ اہلِ ہند ہماری زیرِ حکومت بد سے بدتر حالت کو پہونچتے جاتے ہیں۔ یہ نہایت اہم مسئلہ ہے جس پر حکومت کو توجہ کرنا ضروری ہے'' (صفحہ ۵۰ دادا بھائی)

۱۸۵۷ء میں مینچسٹر ٹاؤن ہال میں مسٹر برائٹ نے ایک تقریر کے دوران میں فرمایا :۔

''میں کہتا ہوں کہ وہ حکومت جو ایسی ہو کوئی مہلک نقص رکھتی ہے۔ اور یہ نقص کسی وقت اُس حکومت کو اور نیز اُس قوم کو جس کی طرف سے وہ حکمرانی کرتی ہے تباہ اور ذلیل کر کے رہے گا'' (ص ۶۲۰ دادا بھائی)

خلاصہ یہ کہ باوجود بہت کچھ صدائے احتجاج بلند کرنے کے اس زمانہ میں انتظامی عہدوں سے ہندوستانیوں کا اخراج عملاً جاری رہا۔ چوں کہ ہندوستانی لوگوں کو اپنی ذہانت اور ملکی معاملات میں اپنی قابلیت دکھانے کے مواقع باقی نہ تھے اس لئے یہ اوصاف اُن سے رخصت ہو گئے۔ غیر ملکی لوگ مثل مشین کے کام کرتے تھے۔ نہ وہ ملکی ضرورتوں سے باخبر تھے اور نہ ہندوستانیوں کے ساتھ ان کا رویّہ ہمدردانہ تھا۔ ہندوستان میں ان کے رہنے کا صرف یہ مقصد تھا کہ جس قدر بھی ممکن ہو روپیہ پیدا کیا جائے تاکہ جس قدر جلد ہو سکے وہ ہندوستان سے اپنے وطن انگلستان میں جاکر نوابانہ زندگی بسر کریں۔ اس طریقہ حکومت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی اس حالت کو پہونچ گئے جس کا ذکر سطور بالا میں ہوا ہے۔

۲۲- امن پسندی کا زمانہ اور دوامی بندوبست کی نامنظوری

مندرجہ بالا اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ غدر کے بعد عام طور پر انگریزوں کے خیالات ہندوستانیوں کے متعلق ہمدردانہ تھے۔ دوران غدر میں گورنر جنرل لارڈ کیننگ تھے۔ ان کے بعد لارڈ الگن، لارڈ لارنس، لارڈ میو، لارڈ نارتھ بروک یکے بعد دیگرے ہندوستان کے وائسرائے ہوئے۔ گویا ۱۸۵۶ء سے ۱۸۷۶ء مسلسل بیس سال تک جو وائسرائے ہندوستان میں رہے وہ کسی نہ کسی صورت میں اہل ہند کی بہبودی کے لیے ساعی رہے جن کی تفصیلات میں طوالت ہوگی۔ یہ لوگ صلح کل تھے۔ باوجودیکہ انگلستان کی گورنمنٹ کی طرف سے ان پر زور پڑتا رہا کہ یہ سرحد پر جارحانہ لڑائیاں لڑیں مگر انھوں نے ہندوستان کو لڑائی کے خرچ کی زیرباری سے محفوظ رکھا انگریزی عملداری سے قبل اگرچہ ضابطہ کے طور پر ملک کی پیداوار میں سلطنت کا معتدبہ حصہ تھا مگر اس کی وصولی میں سختی نہ کی جاتی تھی۔ انگریزوں کی عملداری میں جو کچھ مقرر کیا گیا وہ سختی سے وصول کیا جاتا تھا۔ خواہ اس سے کاشتکار یا زمیندار مقروض ہوکر برباد کیوں نہ ہو جائے۔ ابتدا میں بعض صوبوں میں ۱۸۸۳ء تک مال گزاری زیادہ سختی مگر انجام کار سہارنپور کے قواعد (مرتبہ ۱۸۵۵ء) کی رو سے پچاس فی صدی اصولاً مقرر کر دی گئی۔ مگر یہ وہ صوبے تھے جہاں بندوبست میعادی تھا سب سے اول لارڈ کارنوالس نے بنگال میں دوامی بندوبست کا قاعدہ جاری کیا جو اگرچہ شروع میں نہایت سخت مالگزاری پر کیا گیا تھا مگر بعد میں جب زمین کی آمدنی بڑھی تو سلطنت کو اس کے بے شمار فوائد نظر آنے لگے۔ مثلاً یہ کہ کاشتکاروں کو اپنی حالت پر اطمینان ہوگا اور اس سے

اُن کی دولت بڑھے گی تو لامحالہ اُس سے سلطنت کو طرح طرح کے فوائد حاصل ہوں گے وہ انگلستان کا مال خریدنے کے قابل ہوں گے۔ وہ مختلف قسم کے ٹیکس برداشت کر سکیں گے اور ملک روز روز کے قحطوں سے محفوظ ہو جائے گا۔ چنانچہ کرنل بیرڈ (COL BAIRD) نے ۱۸۶۱ء میں اس امر کی بخوبی جانچ کر لی کہ قانون اراضی میں اصلاح کرنے سے قحط کا زور بیحد کم کیا جا سکتا ہے اور اس بنا پر دوامی بندوبست کی سفارش کی اور سر چارلس وڈ (SIR CHARLES WOOD) سکریٹری آف اسٹیٹ ہند نے ۹ جولائی ۱۸۶۲ء کو اس سفارش کی تائید کی اور سلطنت برطانیہ کی گورنمنٹ نے اُس کو منظور کر لیا۔ اور ۲۳ مارچ ۱۸۶۷ء کو وزیر ہند سر اسٹیفورڈ نورتھ کورٹ نے ہر مجسٹی کی گورنمنٹ کے اس فیصلے کی کہ بندوبست استمراری جاری کر دیا جائے دوبارہ تصدیق کی۔ وہ لکھتا ہے کہ "ہر مجسٹی کی گورنمنٹ تیار ہے کہ مال گزاری میں اضافہ ہونے کی امید کو قربان کر دے اس لیے کہ مالکان آراضی کی اغراض کو حکومت برطانیہ کی بقا سے وابستہ کر دینا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔" (ص ۸۸ دت جلد دوم)

مگر خدا کی قدرت کہ جو تجویز ملکہ معظمہ نے ۱۸۶۲ء میں منظور کر لی تھی اور ۱۸۶۷ء میں مستحکم ہوئی تھی اور اُس کے متعلق رعایا کے دلوں میں خوشی اور امید کے جذبات پیدا ہو چکے تھے اور صوبہ آگرہ کے بعض مشرقی اضلاع میں اس کا نفاذ بھی ہو چکا تھا اُس فیصلہ کو اکیس سال بعد ۲۸ مارچ ۱۸۸۳ء کو سکریٹری آف اسٹیٹ نے ان الفاظ میں منسوخ کر دیا: "جس پالیسی کی داغ بیل ۱۸۶۲ء

میں رکھی گئی تھی اب وقت آگیا ہے کہ اُس کو باضابطہ ترک کر دیا جائے"۔ (صفحہ ۲۹۹ ذ ث)

اب سوال یہ ہے کہ حکام وقت نے اکیس سال بعد اپنے فیصلہ سے کیوں رجوع کیا۔ کیا اس وجہ سے کہ ۱۸۶۲ء میں کرنیل بیرڈ نے جو رپورٹ کی تھی وہ صحیح وجوہ پر مبنی نہ تھی کیا گورنمنٹ کو اس امر کا اطمینان ہو گیا تھا کہ جن مقامات میں دوامی بندوبست جاری ہوا تھا وہاں کے کاشتکاروں کی حالت خراب ہو گئی تھی یا وہاں کے زمیندار غریب ہو گئے تھے۔ کیا گورنمنٹ کے نزدیک دوامی بندوبست سے ملک کی صنعت و حرفت کو نقصان پہونچا تھا۔ کیا یہ امر کہ دوامی بندوبست کی وجہ سے لوگ قحطوں سے محفوظ رہتے ہیں محض ایک ڈھکوسلا تھا غالباً ان وجوہ میں سے ایک بات بھی نہ تھی۔ بلکہ گورنمنٹ کو رعایا کے مسلسل وفاداری کی طرف سے کامل اطمینان ہو گیا تھا۔

اوپر عرض کیا گیا ہے کہ سہارنپور کے قواعد مالگذاری کو اصولاً تمام ہندوستان کے لئے تسلیم کر لیا گیا تھا اور وہ یہ کہ پچاس فی صدی سے زیادہ مال گزاری نہ لگائی جائے مگر کچھ عرصہ بعد اُس کی خلاف ورزی بھی شروع کر دی گئی اور ابواب کے نام سے فرید محصول لگایا گیا۔ جس کی مقدار مختلف صوبجات میں مختلف ہے۔ صوبۂ متحدہ میں ابواب کی شرح ابتداءً ۶ ۱/۴ اور آخر میں دس فی صدی مقرر کی گئی اور اب بھی یہی ۱۰ فی صدی شرح جاری ہے اور چندہ شفاخانہ اس کے علاوہ ہے۔

انھیں حالات کے درمیان جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی نے جس نے ہندوستان

کے لیے اصلاحات جاری کرنا تجویز کی تخمیں ۱۹۱۹ء میں یہ سفارش کی کہ مسئلہ بندوبست مالگذاری کو قانونی صورت دی جائے اور اس قانون میں یہ امور کہ نکاسی پر مال گزاری کی فی صدی کیا شرح مقرر کی جائے۔ اضافہ کے حدود کیا ہوں۔ میعاد بندوبست کیا ہو اور اسی قسم کے دیگر مراتب داخل کر دیئے جائیں۔ اسی کمیٹی نے اصول بندوبست میں یہ جدت بھی تجویز کی کہ ان لوگوں کو جن پر تشخیص مال گزاری کا سب سے زیادہ اثر پڑتا ہو یعنی زمیندار اور کاشتکاران کو اس سے قبل کہ گورنمنٹ اپنی مالگذاری کی پالیسی کو قانونی صورت دے اس معاملہ میں اظہار رائے کا موقع دیا ہے۔ اس سفارش کی بنا پر صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ نے جون ۱۹۲۲ء میں مسئلہ بندوبست پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی ترتیب دی۔ جس نے چھ ماہ کے کامل غور و خوض کے بعد۔ چند سفارشات گورنمنٹ کو بھیجیں۔ ان سفارشوں کو لیے ہوئے آج سے ڈھائی سال پہلے گورنمنٹ نے کونسل میں ایک مسودہ قانون پیش کیا۔ لیکن کونسل اس مسودہ سے مطمئن نہ تھی۔ اس لیے گورنمنٹ کو وہ مسودہ واپس لینا پڑا۔ مگر گورنمنٹ نے ان مراتب کو جو اس مسودۂ قانون میں درج تھے قواعد کی صورت میں نافذ کر دیا۔ ان قواعد کی رو سے ایک طرف تو تشخیص مال گزاری کی شرح کا اوسط ۵۰ فی صدی سے گھٹا کر ۴۰ فی صدی کر دیا گیا۔ اضافہ مال گزاری میں یہ قید لگا دی گئی کہ ۳۳ ⅓ فی صدی سے زیادہ اضافہ نہ ہو اور جو کم از کم قابل تشخیص نکاسی کا ایک نہائی ہو۔ اور دوسری طرف انھیں قواعد نے مہتمم بندوبست کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ متوقع نکاسی جس کو "فوری قابلِ وصول لگان" کے فرضی نام سے موسوم کیا جاتا ہے

مال گزاری تشخیص کرے اور ان قواعد نے اس اصول کو بھی جس کی بنا پر حلقہ کی شرح قائم کی جاتی تخفیف وسعت دیدی اور یہ اسی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ ان مختلف اضلاع میں جو اس وقت زیر بندوبست ہیں مال گزاری میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔

۲۳- انگلستان کے ووٹروں کی وجہ سے ہندوستان کا نقصان | اوپر بیان کیا گیا ہے کہ غدر کے وقت سے ۱۸۷۶ء تک مسلسل پانچ وائسرائے ایسے آئے جو اہل ہند کی بھلائی کے لیے ہر طرح کوشش کرتے رہے اور ہندوستان کو ناواجب خرچوں سے بچاتے رہے۔ چنانچہ جب ابی سینا کی جنگ کے خرچہ کا مطالبہ ہندوستان سے کیا گیا تو لارڈ لارنس گورنر جنرل نے اس کی مخالفت کی جو نامنظور ہوئی اور باوجود ایسے ہمدرد حکمرانوں کی پشت پناہی کے ہندوستان کا افلاس روز بڑھتا گیا۔ اسی طرح لارڈ کیننگ نے ۱۸۵۹ء میں ایک مسودہ قانون منظور کرایا جس نے محصولات درآمد کو جو برطانوی سامان پر لیے جاتے تھے بڑھا کر ان محاصل کا ہم شرح کر دیا جو دیگر بیرونی ممالک کی مصنوعات پر قائم تھے اور ساتھ ہی یہ اجازت دے دی کہ یہ اضافہ شدہ محاصل رائج الوقت شرح کے مطابق قائم کیے جائیں۔ لیکن اس قانون سے برطانوی تاجر جو ہندوستان میں تھے بہت بددل ہوئے۔ چنانچہ پہلا ہندوستانی وزیر جیمز ولسن جب ہندوستان آیا تو اس نے حکماً اس جوش کے جو پیدا ہوگیا تھا ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ۱۸۶۰ء میں اس نے ہندوستان کی خام اجناس کو برآمد کے محصول سے آزاد کر دیا۔ اور آنے والی مصنوعات کے محاصل بہت کچھ کم کر دیئے۔

برطانوی تاجروں کی اس طرح تسلی کر دی گئی لیکن ہندوستان کی آمدنی میں تخفیف ہو گئی اور وہ بھی ایسے وقت جب کہ ضرورت حد درجہ شدید تھی۔ (ص ۳۴۷ دت حصہ اول)

اسی قسم کی کتنی تجاویز صنعت و تجارت کے متعلق ہندوستان کی طرف سے انگلستان کو جاتی رہیں مگر بالعموم خارج ہوتی گئیں۔ وجہ صرف یہ ہے کہ سکریٹری آف اسٹیٹ ہند انگلستان کے تاجروں اور ووٹروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور ان کا تابع ہے چنانچہ لارڈ لارنس وائسرائے ہند نے ایک شہادت کے بیان میں کہا۔ "لیکن جب کوئی اہم مسئلہ پیش آجاتا جس سے انگریزی تاجروں کی اغراض اور خواہشات وابستہ ہوتیں تو میرے خیال میں کونسل کی مخالفت بے سود ہی رہتی تھی"۔ (ص ۱۴۳ دت ۱۱)

اور سر جان لارنس نے سر ارسکن پیری کو جو اُس وقت وزیر ہند کی مجلس کا رکن تھا ایک نجی خط میں لکھا کہ:۔

"حکومت ہند ان معاملات میں اگر دیانت داری کے ساتھ کارروائی کرنا چاہے تو مشکلات عظیم سدّ راہ ہوتی ہیں۔ دیسیوں کی امداد میں کوئی قدم اٹھائیے یا اُٹھانے کی کوشش کیجیے۔ تو دیکھیے کیسا شور برپا ہو جاتا ہے۔ جس کی صدائے بازگشت انگلستان تک پہونچتی ہے اور وہاں کے لوگوں کو موید اور ہمدرد بنا لیتی ہے۔ بعض اوقات میری عقل کام نہیں کرتی کہ کیا کروں۔ اصولاً ہر شخص انصاف اعتدال اور اس قسم کی دوسری خوبیوں کا حامی ہے۔ لیکن جب ان اصول پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے اور اُس سے کسی کے مفاد کو صدمہ پہونچتا ہے تو یہ لوگ

بدل جاتے ہیں" (سوانح لارڈ لارنس مصنفہ باسورتھ اسمتھ ص ۲۴۷ دت حصہ ۲)

۴۲۔ سلطنت کی پالیسی میں تبدیلی | مندرجۂ بالا واقعات سے معلوم ہوگا کہ ہندوستان کو جو نقصان پہونچتا رہا وہ زیادہ تر انگلستان کے تاجروں اور ووٹروں کے زور اور اُن کی مخالفانہ رایوں سے پہونچتا رہا جو ذاتی مفاد پر مبنی تھیں۔ ناظرین کو اس امر کا بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ہندوستان میں ۱۸۵۸ء سے ۱۸۷۵ء تک مسلسل ایسے حکمراں رہے جو ہر طرح ملک کی ترقی میں ساعی تھے اور اُنھوں نے اپنے زمانہ میں کوئی لڑائی نہ لڑنے دی جس سے ہندوستان پر خرچہ کا بار پڑتا۔ اُسی کے ساتھ زرعی صنعتی اور تجارتی ترقی کے لیئے اونھوں نے دوامی بندوبست کئے اور ہندوستان کے مال پر محصول میں کمی اور انگلستان کے مال پر بیشی کرنے کی کوشش کی لیکن ایک پیش نہ چلی اور باوجود اسی صلح کل اور مصلحانہ پالیسی کے ان اٹھارہ سال میں ہندوستان کے قرضہ کا بار آٹھ کروڑ پونڈ سے بڑھکر ۱۳½ کروڑ پونڈ تک پہونچ گیا۔ اس دوران میں انگلستان کی پبلک کے دلوں میں توسیع سلطنت کے ولولے پیدا ہوگئے اور ان لوگوں کی چڑھ بنی جو پیش قدمی کی پالیسی کے حامی تھے۔ پہلے سر بارتھ فریر نے کئی بار کوشش کی تھی کہ افغانستان کی طرف پیش قدمی کی جائے بالآخر وہ اپنے منصوبہ میں کامیاب ہوئے اور لارڈ نارتھ بروک پر زور ڈالا گیا کہ وہ اس پالیسی پر عملدرآمد کریں۔ لارڈ نارتھ بروک اس کو ہندوستان کے لیئے مضر سمجھتے تھے۔ اس لیے وہ ۱۸۷۶ء میں وائسرائے ہند کے عہدہ سے استعفا دے کر انگلستان واپس چلے گئے اور ان کی جگہہ لارڈ لٹن تشریف لائے تو اونھوں نے پیش قدمی کی پالیسی کی

تعمیل میں کابل کو مشن بھیجا اور اُسی سلسلہ میں کابل کی لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں دو کروڑ پونڈ صرف ہوا۔ جس میں لارڈ لٹن کی کوشش سے انگلستان سے صرف پچاس لاکھ پونڈ حاصل ہو سکا۔ باقی ڈیڑھ کروڑ پونڈ کا بار ہندوستان پر ڈالا گیا۔ واضح ہو کہ حضور ملکہ معظمہ کی تخت نشینی کے زمانہ سے لارڈ لٹن کے زمانہ تک پانچ قحط پڑ چکے تھے جن کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۸۳۷ء و ۱۸۶۰ء و ۱۸۶۶ء و ۱۸۶۹ء و ۱۸۷۴ء اور ملک میں قحط کے علامات نمایاں تھے کہ ۱۸۷۷ء میں قدیم پایہ تخت دہلی میں ایک عظیم الشان دربار منعقد کیا گیا جس میں سلطنت اور رعایا کا بے شمار روپیہ صرف ہوا۔ اور عین دربار کے سال اور اُس سے اگلے سال یعنی ۱۸۷۸ء میں سخت قحط پڑا۔

مگر ہندوستان کے قحطوں کی خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں غلہ کی کمی نہیں ہوتی جتنی کہ دیگر ممالک کو غلہ جاتا رہتا ہے اور خود ملک کے غربا بھوکوں مرتے ہیں۔ چنانچہ ۱۸۷۷ء کے قحط میں ہندوستان سے غلہ اس قدر زیادہ باہر گیا۔ جس کی نظیر کم ملے گی۔ ہندوستان کے قحطوں میں سب سے زیادہ بھوکے وہی لوگ مرتے ہیں جو غلہ پیدا کرتے ہیں جن لوگوں کا پیدا کیا ہوا گیہوں یورپ کے اُمرا آرام سے کھاتے ہیں خود اُن کاشتکاروں کو موٹا اناج بھی کھانے کو نہیں ملتا صرف اس لیے کہ سرکاری محصول دینے کے لیے وہ چند روز بھی اپنے غلہ کو نہیں روک سکتے بلکہ جلد سے جلد بازاروں میں پہونچا کر ایک حصہ قرضہ میں دے دیتے ہیں اور ایک حصہ سرکاری مالگزاری یا لگان میں ادا کرتے ہیں اور

آیندہ زندگی بسر کرنے کے لیئے مہاجن سے رجوع کرتے ہیں۔ یہ تو اُس زمانہ کے حالات ہیں جب کہ بارش معمولی طور پر ہوتی رہتی ہے مگر بدقسمتی سے اُس میں ذرا بھی کمی و بیشی ہوجاتی ہے اور کوئی آفات ارضی و سماوی واقع ہوتی ہیں تو سوسائٹی کا تمام نظام درہم برہم ہوجاتا ہے اور اچھی خاصی کمائی کرنے والے لوگ گداگری کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ واضح ہو کہ باوجود ملک کی اس حالت کے پیش قدمی کی پالیسی اختیار کی گئی۔ جس میں کروڑوں کا صرف تھا۔

۲۵۔ ہندوستانیوں کے ساتھ عہد شکنی | لارڈ لٹن انگلستان کے ووٹروں کی اس پالیسی پر عملدرآمد کرنے کے لیے آئے تھے اور وہ کنسرویٹو پارٹی سے تعلق رکھتے تھے تاہم انھوں نے اس امر کو محسوس کیا کہ ہندوستانیوں کے ساتھ ایفاء وعدہ نہیں کیا جاتا اور انھیں اُن کے جائز حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے چنانچہ لارڈ موصوف نے ہندوستانیوں کو انگریزوں کے برابر عہدے ملنے کے بارہ میں جو اظہار خیال کیا اُس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

"۱۸۳۳ء کا مسودۂ قانون جو پارلیمنٹ نے منظور کیا ہے اتنا مبہم ہے اور دیسی باشندوں کے متعلق حکومت ہند کی ذمہ داریاں محتاج تشریح رکھتا ایسی بین غلطی ہے کہ قانون منظور ہوتے ہی اس کے نتائج ظاہر ہونے لگے اور حکومت ہند اُس کی پابندی سے گریز کرنے کی تدابیر کرنے لگی۔ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے روز افزوں طبقے نے جس کی ترقی میں حکومت ساعی رہتی ہے مگر اُس کی خواہشات کو پورا نہیں کرسکتی۔ اس قانون

کی دفعات کا مطالعہ کیا ہے اور دل پر نقش کر لی ہیں۔ اب اس قانون کی رو سے اگر کسی ہندوستانی کو ایک بار ایسا عہدہ مل جائے جو پہلے سول سروس والوں کے لیے مخصوص تھا تو اُس کو یہ توقع اور یہ دعوے کرنے کا حق ہے کہ ترقیات کا زینہ بالتدریج طے کرنے کے بعد بڑے سے بڑے عہدہ پر اُس کا تقرر ہو سکتا ہے ہم سب سمجھتے ہیں کہ یہ حقوق اور یہ توقعات نہ کبھی پوری کی جائیں گی نہ کی جا سکتی ہیں گویا ہمارے سامنے اس وقت دو راہیں تھیں یعنی ممنوع کر دینا یا فریب دینا اور ہم نے وہ راہ اختیار کی جس میں راست روی سب سے کم تھی "

"مقابلے کے امتحان جیسے کہ انگلستان میں رائج ہیں ہندوستانیوں کے لیے مقرر کرنا یا شرکت امتحان کے وقت امیدواروں کی قید عمر میں تخفیف کر دینا وہ عریاں حیلے ہیں جو بالقصد اس لیے اختیار کیے گئے ہیں کہ اس قانون کو مفلوج اور معطل کر دیا جائے چونکہ یہ تحریر خفیہ ہے اس لیے میں بلا تامل کہنے کو تیار ہوں کہ میرے نزدیک ہندی اور برطانوی دونوں حکومتیں ابھی تک اس الزام کا معقول جواب نہ دے سکی ہیں کہ انھوں نے ہندوستانیوں کے کان تک تو اک وعدہ جانفزا پہونچا دیا۔ لیکن اُن کے قلوب کو ایفا کی مسرت سے محروم رکھنے میں کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا"

ڈیوک آف آرگل کہتا ہے کہ :۔

"میں اعتراف کرتا ہوں کہ ہم ادائے فرض سے قاصر رہے اور ہم نے جو وعدے اور پیمان کیے تھے پورے نہیں کیے"

اسی سلسلہ میں لارڈ سیلسبری نے کہا :۔

"دوستو! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس گندم نمائی اور جو فروشی سے فائدہ کیا ہے" (ص ۳۱۸ - دادا بھائی)

ایک طرف تو ہندوستانیوں کے ساتھ اُنھیں عہدے دینے میں بہ بدعہدی اور اُن کی دل شکنی! اور اس پر لطف یہ کہ جب ملک میں قحط پڑنے کی وجہ سے کمیشن تحقیقات بٹھایا گیا تو اُس میں سفارش کی گئی کہ اور یوروپین بڑھائے جائیں - یہ کیسی عجیب و غریب منطق ہے کہ افلاس کا تو علاج تجویز کیا جائے اور اخراجات بڑھا دیے جائیں اور وہ بھی اپنے اعلان اور معاہدے کے خلاف اسی طرح سلطنت کے روز افزوں مطالبات سے تنگ آکر وزیر ہند لارڈ سیلبری ۱۸۸۱ء میں ایک یادداشت میں لکھتا ہے کہ "ہندوستان سے اتنی کثیر رقم باہر بھیجدی جاتی ہے اور اُس کا نعم البدل کچھ نہیں دیا جاتا۔ یہ زخم بجائے خود کیا کم ہے - لیکن ہندوستان کے بدن پر لگتا ہی تو اور زیادہ گہرا لگتا ہے - اگر خون ہی بہانا ہے تو چھُری اُس حصّے میں بھونکنا چاہیئے جہاں لہو بہت سا یا کافی جمع ہو، نہ کہ دیہاتی رقبوں میں جو پہلے سے ہی خون کی قلت کے باعث نحیف و ناتوان ہو رہے ہیں - اب وقت ہی کہ ہندوستان کے بدن سے یہ لہو بہنا رُک جانا چاہیئے"

وزیر ہند ایک خط میں وزیر اعظم کو لکھتے ہیں :-

"سرکاری آمدنی کے ذرائع اور محاصل کے لحاظ سے ہندوستان ایک انوکھی حیثیت رکھتا ہے وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ یہاں کے باشندوں کی عادات نئی قسم کی ہیں اور وہ کسی تغیر کو بالخصوص محصولات کے ردو بدل کو

سخت ناپسند کرتے ہیں۔ بلکہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہاں کی حکومت ایک نوعیت رکھتی ہے یعنی غیر ملکیوں کے ہاتھ میں ہے، جو تمام انتظامی عہدوں کے مالک ہیں اور فوج میں اس قدر کثرت سے بھرے ہوئے ہیں چنانچہ نئے محصول اگر لگائے گئے تو اُن کا اصلی سبب غیر ملکی حکومت کا یہ بار ہوگا اور فی الحقیقت اس ضرورت سے لگائے جائیں گے کہ اُن مصارف کی بیشی پوری کی جائے جو بیرون ملک میں پیش آتے ہیں۔ لہٰذا ایسے محاصل سے بیزاری پیدا ہوگی اور یہ بیزاری ایک سیاسی خطرے کی شکل اختیار کر لے گی۔"

۷۔۲۔ سیاسی حقوق ملنے کی ابتدا ان تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کیا بہ اعتبار ہندوستانیوں کو عہدے دینے کے اور کیا بہ اعتبار ہندوستان کی مالی حالت کے کوئی بہتری کی صورت پیدا نہ ہوئی اور ہندوستان کا قدم کسی صورت سے بھی آگے نہ بڑھ سکا حتیٰ کہ ۱۸۸۰ء میں وہ وائسرائے تشریف لائے جن کا نام ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیگا۔ یہ وائسرائے لارڈ رپن تھے جنھوں نے ہندوستان کو وہ قوت دینے کی ابتدا کی جس کے ذریعہ انگلستان نے ڈیڑھ سو سال سے ہندوستان کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ یہ قوت "ووٹ کی قوت" تھی جس کی پہلی قسط لارڈ رپن نے لوکل بورڈوں کی صورت میں عطا کی اور یہی وہ قوت ہے جس کے نشو و نما سے ہندوستان انگلستان کے صناعوں، تاجروں اور سرمایہ داروں کے چنگل سے نکل کر حقیقی معنوں میں سلطنت برطانیہ کا دست و بازو

بن سکتا ہے اس کے علاوہ لارڈ رپن نے پریس کو آزادی دی۔ ریاست میسور اس کے مستحق قدیم راجہ کو واپس دی یورپینوں کے مقدمات فیصل کرنے میں ہندوستانیوں کو مساوی حق دینے کی کوشش کی اور ان کی رخصت کا وقت آیا تو ہندوستانیوں کی اُن کے ساتھ گرویدگی کی یہ کیفیت تھی کہ بقول میر بٹر بیٹھ ٹون سینیڈ کے "ان (لارڈ رپن) کا شملے سے بمبئی تک کا سفر ایسا فاتحانہ کوتح تھا جس کا نظارہ اس سے قبل ہندوستان کو نصیب نہیں ہوا تھا یہ ایک طول طویل جلوس تھا جس میں، کروڑ آدمی اپنے ہمدرد کی ثنا و صفت کے گیت گا رہے تھے۔"

لارڈ رپن کی نسبت وا اجبی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ سلطنت کی جڑیں مضبوط کرنے والے شخص تھے۔ کاش ان کی پالیسی پر ان کے بعد بھی عملدرآمد کیا جاتا تو ملک بھی خوش حال ہوتا اور سلطنت برطانیہ کو بھی اس سے زیادہ تقویت ہوتی مگر بد قسمتی سے اُن کے بعد جو وائسرائے آئے وہ مسلسل پیش قدمی کی پالیسی پر قائم رہ کر توسیع سلطنت کے ساعی رہے جس سے ہندوستان کی زیر باری میں اضافہ ہوتا رہا۔ ایک طرف تو جنگ کے اخراجات کا بار بڑھا اور دوسری طرف دیسی صنعت تباہ ہو جانے اور مال گزاری کی گرانباری سے ملک میں افلاس کی زیادتی ہوئی جس سے ملک میں مسلسل قحط پڑنے لگے۔ چنانچہ اُنیسویں صدی کا آخری حصہ انھیں قحطوں میں گزرا۔ لارڈ رپن کے بعد لارڈ ڈفرن وائسرائے ہوئے جن کے عہد میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی۔ اور اس ہی زمانہ سے سیاسی نشو و نما شروع ہوا جس کا مختصر خاکہ ہم ابتدا میں پیش کر چکے ہیں اس لئے

اب اس کا اعادہ غیر ضروری ہے۔

باب پنجم

رجعت پسندوں کی کامیابی

۲۷- اہلِ ہند کی ترقی کا دوسرا مخالف گروہ

مندرجہ بالا صفحات میں ہم نے زیادہ تر انھیں فیاض طبع اور نیک مزاج انگریزوں کے طرز عمل اور اقوال کا ذکر کیا ہے جو انگلستان کی بہبودی اسی میں سمجھتے تھے کہ ہندوستان کو مرفہ الحال بنایا جائے۔ ان کے مقابلہ میں انگلستان کے کارخانہ داروں اور تاجروں کی ایک جماعت تھی جو اپنے ووٹوں کی قوت کے دباؤ سے اپنے لئے ہندوستان میں اقتصادی مراعات حاصل کرتی رہتی تھی۔ اور جس سے اُن کی دولت میں اضافہ ہونے کے ساتھ ہندوستان روز بروز مفلس ہوتا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں حکمران انگریزوں کی ایک جماعت تھی جس کو یہاں اس قدر زیادہ معاوضہ ملنے لگا کہ اس کی نظیر دنیا بھر میں کہیں نہیں ہے اور جس کو ملک کے جزوی امور میں اس قدر اختیارات حاصل ہوئے کہ جو شاہان سلف میں کسی کو نصیب نہ ہوئے تھے زمانہ ہائے ماسبق میں حکمرانوں کو برائے نام غیر محدود اختیارات حاصل تھے لیکن انھیں دیہاتی رعایا سے براہ راست کوئی

تعلق نہ ہوتا تھا۔ دیہات کے لوگوں کو بجز پیداوار کا ایک حصہ دے دینے کے بادشاہ سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اور اگر کچھ پیداوار نہ ہوتی تو کچھ دینا نہ پڑتا تھا۔ اور جیسا کہ مختلف تجربات سے ظاہر ہوا ہے دیہات کے لوگ اندرونی نظم و نسق میں کامل خود مختار تھے اور اُن پر پولیس اور عدالتوں کا کوئی دباؤ نہ تھا برخلاف اس کے انگریز حکمرانوں کو قانون کی رو سے گانوں کے ایک ایک فرد پر اختیار اور اقتدار حاصل ہو گیا اور دیہی پٹواری اور چوکیدار جو کسی زمانہ میں خود ان کے دست نگر تھے حکمرانوں کی طرف سے ان کے سروں پر مسلط کر دیے گئے۔ اس نظام کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ حکمراں لوگوں میں سے ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی جسے کثرت آمدنی اور زیادتی اختیارات میں لطف آنے لگا۔ اسی جماعت کے لوگوں کو اہلِ ہند بیوروکریسی (BUREAUCRACY) کے لقب سے موسوم کرتے ہیں اور جن میں کچھ نیک دل لوگوں کو چھوڑ کر زیادہ تر ایسے ہیں جو اپنے اختیارات میں کمی آنے کو موت کا مترادف سمجھتے ہیں اور جب اہلِ ہند کو مراعات ملنے کا وقت آتا ہے تو اُس میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔

چنانچہ اس جماعت کی خصوصیات کو سر ولیم وڈربرن نے اپنی ایک تقریر میں جو ایک دعوت کے موقع پر دسمبر ۱۸۸۹ء کو نیشنل لبرل کلب میں کی تھی بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ سر ولیم موصوف ستائیس برس تک سول سروس کے ایک عہدہ دار رہے تھے۔ اس لیے اس بارہ میں اُن کی جو رائے تھی وہ ایک وسیع تجربہ پر مبنی تھی۔ اونھوں نے فرمایا تھا کہ " جملہ ممالک میں ٹیکس دینے والوں اور عہدہ داروں یعنی ٹیکس کے کھانے والوں کے مفاد میں

یکسانیت نہیں ہوتی ہے۔ بالخصوص ہندوستان میں یہی حالت ہے۔
ہندوستانیوں کا نفع اس میں ہے کہ ملک میں امن ہو۔ سلطنت کے
اخراجات میں کفایت شعاری اور اصلاح ہو۔ مگر یہ تمام چیزیں اُن سازش
کنندوں کو ناگوار ہیں جو شملہ میں حکومت کرتے ہیں۔ یہ ہماری لڑائی یا اس
قسم کی اور لڑائیوں کے اونھیں طرح طرح کے فوائد حاصل ہیں۔ مملکات کے
اضافہ سے اونھیں طرح طرح کے خطابات اور ترقیاں اور گورنریاں اور دوسری
عزت کی چیزیں ملتی ہیں۔ پھر یہ کہ عہدہ داروں سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے
کہ وہ کفایت شعاری کو پسند کریں جس پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اُن کی
تنخواہوں میں کمی ہو جائے گی۔ اور اُن سے یہ کیسے اُمید کی جا سکتی ہے کہ
وہ اصلاحات کے لیئے ووٹ دیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اُن کے غیر محدود
اختیارات کو محدود کر دیا جائے اس لیئے اُن سے ملک میں کفایت شعاری
اور اصلاح کی امید رکھنا عبث ہے میں اُن لوگوں کو کوئی الزام نہیں دینا چاہتا
جن کے محسوسات اس پیشہ کے اختیار کرنے کی وجہ سے ایسے ہو گئے ہیں
بلکہ اصلی الزام اُس نظام پر ہے جس کی رو سے ان لوگوں کو غیر محدود اختیارات
حاصل ہیں۔ انگلستان میں اگرچہ خرچ کرنے والے محکموں کے اختیارات برائے
نام ہمارے ہاتھ میں ہیں مگر اُن اختیارات پر پوری طرح عمال کا عملدرآمد کرنا
قریباً ناممکن ہے۔ مگر ہندوستان میں جہاں کہ اُن محکموں کو کامل اختیارات
حاصل ہیں اور جہاں کہ ٹیکس دینے والوں کا صرف یہ کام ہے کہ جو اُن سے
طلب کیا جائے اُس کی ادائیگی کر دیا کریں بہبودی کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

(تقاریر و تحریرات سر ولیم وڈربرن صفحہ ۴۸۶/۴۹۶)

بہرحال ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی اگر یہ کہا جائے کہ یہ طرز عمل ان کی بدنفسی کا نتیجہ ہے۔ نہیں۔ بلکہ یہ تو اُس نظام کا نتیجہ ہے جس نے حکمراں جماعت کے لوگوں کو خودغرض اور تنگ نظر بنا دیا ہے۔ اسی خیال کے لوگوں کے طرز عمل کی بدولت ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا اور ہنگامہ ہونے کے بعد اونھوں نے اہلِ ہند کو مختلف طریقوں سے دبانے اور اُن قوتوں کو منتشر کرنے کے طریقے اختیار کیے اور ملکہ معظمہ قیصر ہند کے اعلانات پر جو ہندوستانیوں اور انگریزوں میں مساوات قائم کرنے کے متعلق تھے کبھی عملدرآمد نہ ہونے دیا۔

نظام گورنمنٹ اس حکمراں جماعت کے مخالفانہ طرز عمل کا ذمہ دار ہے۔

۲۸۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ہندوستان کی حکمراں جماعت کے ارکان ان لوگوں میں سے منتخب کیے جاتے ہیں جو وسیع الخیالی میں ضرب المثل ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ملازم ہوتے ہی اُن کے سطح نظر میں تبدیلی کیوں واقع ہو جاتی ہے اور ہندوستان کے مفاد کو وہ اپنے مفاد کے منافی کیوں سمجھنے لگتے ہیں۔ اور سخت دل، خودغرض، ہمدردی سے معرا اور آزادی رائے عامہ کے مخالف کیوں ہو جاتے ہیں۔ اس کا جواب وہی ہے کہ اُن کے مزاج کی تبدیلی کا ذمہ دار نظام سلطنت ہے جس کی تصدیق سر ولیم ویڈربرن نے اپنی تقریر مندرجہ بالا میں کی ہے۔ اسی امر کو اُنھوں نے ایک اور تقریر میں جو اُنھوں نے ۱۹۰۳ء میں سیسیم کلب میں بمقام لندن کی تھی واضح کیا ہے جس میں بیان کیا ہے کہ "اب ہم حکمرانوں کی مطلق العنان حکومت کے اس نقص کی طرف توجہ کرتے ہیں کہ یہ لوگ رائے عامہ کے مخالف

کیوں ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر ملک کے لوگ بالعموم غلط قسم کے لوگوں پر اعتماد کر لیتے ہیں۔ جان اسٹورٹ مل نے اپنی کتاب "ذمہ دارانہ حکومت" میں اس امر پر زور دیا ہے کہ حکام سلطنت ملک کے بھلے مانسوں سے علیحدہ رہتے ہیں۔ دوسرے انھیں اپنی معلومات کے لیے ہندوستانیوں پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے اور ان کا رجحان خیال یہ ہے کہ غلامانہ اطاعت کرنیوالے لوگ معتبر ہوتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ سر جان گورسٹ نائب سکریٹری ہند نے اپنی مشہور اسپیچ میں جو منی پور کے متعلق دی تھی دارالعوام میں یہ بیان کیا کہ مطلق العنان حکومتوں کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ مضبوط اور آزاد رائے رکھنے والوں سے نفرت کرتے ہیں اور ان کی ہمت شکنی کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بھاڑے کے ٹٹوؤں۔ لالچیوں اور کمینوں کے ہاتھ میں پڑ جاتے ہیں۔

"انگل فس بریچارڈ" نے اپنی کتاب رحالات بجپور) میں وہاں کے کلکٹر کی نسبت یہ مذاق پیرایہ میں یہ لکھا ہے کہ وہ ہندوستانیوں کو حقیر سمجھتا تھا اس نے اپنے ایک دوست سے یہ کہا کہ ہندوستانیوں میں کوئی شخص بھی قابلِ اعتبار نہیں ہوتا۔ پھر سوچ کر کہنے لگا کہ ہاں ایک آدمی کا اس میں استثنا ہے جو بجد ایماندار اور خیر خواہ ہے اور اس کے بعد پتہ چلتا ہے کہ یہ واحد ایماندار شخص انھیں کلکٹر صاحب کا سر رشتہ دار ہے جو ہر طرح ان کا خدمت گزار ہے اور شہر میں سب سے بڑا بدمعاش ہے۔ یہ سر رشتہ دار اپنے آقا کا پورا مزاج داں ہے اور ان کی شیخی بازی سے پورا فائدہ اوٹھاتا ہے اور ان کو

شہر کے بھلے مانسوں اور آزاد خیالوں سے برہم کرتا رہتا ہے۔ یہ چھوٹی سی کہانی اصلیت کے اظہار کا ایک پُراثر قصہ ہے اس لیے کہ سلطنت کے تمام حکام بجنور کے کلکٹر ہی کی طرح ہیں جن کو نالائق ترین لوگوں کے انتخاب میں کامل دستگاہ حاصل ہے۔"

"بالعموم ہمارے اعلیٰ عہدہ داروں کو اپنے خلاف مزاج سچی باتیں ناگوار معلوم ہوتی ہیں اور اس وجہ سے وہ لوگوں کے منتہر علیہ اشخاص کو اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتے اور اپنی مراعات و کرم اُن لوگوں کے لیے مخصوص رکھتے ہیں جو ذلیل ترین خوشامدی اور ہندوستانیوں کے مفاد کے لیے سخت خطرناک جماعت ہے۔"

(تقاریر و تحریرات سر ولیم ویڈربرن صفحہ ۳۲۲)

مندرجۂ بالا تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ ان خرابیوں کی ذمہ داری بجائے اشخاص کے نظام سلطنت پر ہے۔ چونکہ عرصۂ دراز سے یہ نظام جاری ہے اس لیے نسلاً بعد نسلٍ عہدہ داروں میں اُس کی روایات بھی قائم ہوگئی ہیں۔ جن میں سب اچھے بُرے لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں۔

۲۹۔ قدیم ہندوستان کی بے تعصبی | حکمران جماعت کے اس گروہ نے اپنا منصوبہ پورا کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے اُن کا تذکرہ کرنے سے قبل مناسب ہوگا کہ ہندوستان کی سابقہ تمدنی حالت پر نظر ڈالی جائے۔

نواب مرزا یار جنگ بہادر چیف جسٹس حیدرآباد دکن نے پچھلے دنوں ایک کتاب موسومہ "ہند عہد اورنگ زیب میں" تصنیف فرمائی تھی اس میں نواب صاحب موصوف نے کپتان الیگزینڈر ہملٹن کے حوالہ سے شروع سترھویں

صدی کے کچھ حالات قلمبند کیئے ہیں۔ جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت یہاں شروع ہوئی۔ اس زمانہ میں یورپ میں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عقیدوں کے گروہوں کے درمیان اختلاف عقائد کی بنا پر سخت کشت و خون ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ سلطنت کے حکم سے مخالف عقیدہ رکھنے والے لوگوں کے بچوں کو زندہ جلا دینے کے واقعات پیش آتے رہتے تھے۔ برخلاف اس کے ہندوستان کے مختلف عقیدہ رکھنے والوں کو جب کپتان صاحب موصوف نے پُرامن زندگی بسر کرتے دیکھا تو اُن کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کپتان ہمالٹن موصوف نے سندھ کے ایک قدیم شہر ٹھٹھ کی نسبت لکھا ہے کہ۔

"یہاں ریاست کا مسلمہ مذہب اسلام ہے۔ لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے۔ ہندوؤں میں مذہبی رواداری پوری طور سے برتی جاتی ہے۔ وہ اپنے برت رکھتے ہیں اور تہواروں کو اسی طرح مناتے ہیں جیسے اگلے زمانہ میں مناتے تھے جب کہ بادشاہت خود ہندوؤں کی تھی وہ اپنے مُردوں کو جلاتے ہیں لیکن اُن کی بیویوں کو اجازت نہیں ہے کہ شوہر کے مُردے کے ساتھ ستی ہوں" لہ۔

آگے چل کر تحریر ہے "صرف بنیوں کے ۸۵ فرقے ہیں اور گو کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھانا نہیں کھاتے لیکن آپس میں مل جل کر رہتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پارسی بھی ہیں اور وہ اپنے رسوم مذہب زردشت کے بموجب ادا کرتے ہیں۔ عیسائیوں کو پوری اجازت ہے کہ اپنے گرجے بنائیں اور اپنے مذہب کی تبلیغ کریں اور بعض مرتبہ وہ اس میں کامیاب بھی

لہ ہند عہد اورنگ زیب میں صفحہ ۹

ہو جاتے ہیں لیکن جو لوگ عیسائی ہو جاتے ہیں اُن کے اخلاق اس شہر کے تمام لوگوں کے اخلاق سے عموماً بدترین ہوتے ہیں" لے

شہر سورت کی نسبت لکھا ہے کہ "اس شہر میں تخمیناً سو مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں لیکن ان میں کبھی کوئی سخت جھگڑے ان کے اعتقادات و طریقۂ عبادت کے متعلق نہیں ہوتے۔ ہر ایک کو پورا اختیار رہے کہ جس طرح چاہے اپنے طریقہ کے مطابق اپنے معبود کی پرستش کرے" لے

۳۰۔ نفاق کے ذریعہ سے حکومت | مگر موجودہ حکمراں جماعت کے بعض افراد نے حکومت کی جو پالیسی اختیار کی وہ مندرجۂ بالا پالیسی سے مختلف تھی جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ اس عملداری میں دو خیال کے اصحاب تھے۔ ایک اُن وسیع خیال حکام کا گروہ تھا جو ہندوستان کی بہبودی کو انگلستان کی بہبودی سمجھتے تھے۔ برخلاف اس کے دوسرا گروہ تنگ نظر لوگوں کا تھا۔ جو فوری نفع کو آیندہ کے نفع پر ترجیح دیتا تھا۔ ملک کی بدبختی سے آخر الذکر خیال کے لوگوں کو غلبہ حاصل ہوگیا۔ ذیل کے اقتباس سے اس گروہ کے خیالات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

۱۸۲۱ء میں "کارنے ٹکس" کے نام سے کسی انگریزی افسر نے ایشیاٹک جرنل میں ایک مضمون دیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ:-

"ہندوستان میں ہماری حکومت کے ہر صیغہ کو خواہ وہ خارجی

لے ہند عہد اورنگ زیب میں صفحہ ۹۔

لے ہند عہد اورنگ زیب میں صفحہ ۹۔

تعلقات سے واسطہ رکھتا ہو یا عدالتی اور حربی نظم و نسق سے یہ اصول ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیئے کہ تفرقہ ڈال دو اور حکمرانی کرو۔"

سر جان بینارڈ جو کبھی پنجاب ایجی ٹیلیٹو کونسل کا سینیئر ممبر رہ چکا تھا لندن کے ایک اخبار بہ موسومہ معاملات خارجیہ میں رقمطراز ہے :-

"ہندوستان میں خانہ جنگی کی طرف رجحان موجود ہے، جس کا ایک نمونہ ہندو مسلم عناد ہے اور یہ واقعہ ہے کہ یہ رجحان نہ ہوتا تو ہماری حکومت نہ قائم ہو سکتی نہ برقرار رہ سکتی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ہندو مسلمانوں کے مابین عام مخالفت برطانیہ کے عہد میں شروع ہوئی۔ برطانیہ سے پہلے بھی ظالم سلاطین گزر چکے ہیں جنہوں نے کبھی غیر مسلمین پر جزیہ لگایا اور کبھی گائے ذبح کرنے پر مجنونانہ جوش میں سزائیں دیں۔ لیکن یہ واقعات گاہے ماہے پیش آتے تھے۔ شجر علم کا پھل چکھنے سے پہلے عوام میں مذہبی افتراق کا احساس نہ تھا اور خواہ ہندو ہوں یا مسلمان دونوں ایک ہی معبد میں مصروف پرستش رہتے تھے۔" (ماخوذ از ان ہیپی انڈیا مصنفہ لالہ لاجپت رائے صفحہ ۴۰۸)

سر جان بینارڈ کے اس قول سے بڑھ کر اس امر کی اور کیا معتبر شہادت ہو سکتی ہے کہ ہندو مسلم تنازعات انگریزی عملداری میں شروع ہوئے۔ اور انگریزی عملداری سے قبل باوجودیکہ بعض (مسلمان) حملہ آور غیر مسلموں پر جزیہ لگاتے تھے اور بعض ہندو حملہ آور گاؤکشی کرنے پر مسلمانوں کو سخت سزائیں دیتے تھے تاہم ہندو مسلم عوام الناس ایک ہی عبادت گاہ میں پاس پاس امن کے ساتھ عبادت کرتے تھے۔

۱۳۔ ہندوستان ایک قوم سے آباد تھا۔

سرجان بینارڈ کے قول کی تائید میں عدہا تاریخی واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں سے ایک بطور نمونہ کے یہ ہے کہ جب احمد شاہ ابدالی سے مرہٹوں کی لڑائی ہوئی تو مرہٹوں کا توپ خانہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھا۔ توپخانہ ایسی اہم چیز ہے کہ اُس پر لڑائی کا تمام تر دارومدار ہوتا ہے۔ چنانچہ آج تک انگریزوں نے اپنے توپ خانہ کو ہندوستانیوں کی ہوا بھی نہیں لگنے دی بہرحال اُس لڑائی میں احمد شاہ ابدالی کے مقابلہ میں مرہٹے ہار گئے اس وقت احمد شاہ ابدالی نے مسلمان توپچیوں کو ان کی مردانگی اور نمک حلالی پر بڑی داد دی۔ اور اُن سے خواہش کی کہ وہ احمد شاہ کی فوج میں آجائیں اس پر مسلمانوں نے جواب دیا کہ ان کے آقا ہاریں یا جیتیں وہ اُن کا ساتھ چھوڑ کر دوسری جگہ نہیں جا سکتے اس سلسلہ میں ملک کے اندرونی نظام کا اندازہ کرنے کے لیے گورنمنٹ کی رپورٹ پنجم[1] ۱۸۱۲ء سے اقتباس کرنا نامناسب نہ ہوگا اس میں تحریر ہے :۔

"میونسپل (مقامی) گورنمنٹ کے اس سادہ نظام میں اہل ملک ایک نامعلوم زمانہ سے زندگی بسر کر رہے ہیں وہ یہ فکر نہیں کرتے کہ بادشاہت ٹوٹ گئی یا منقسم ہوگئی۔ جب تک اُن کا گاؤں صحیح سالم ہے اُنھیں پروا نہیں کہ وہ کس سلطنت میں شامل ہوگیا یا کس بادشاہ کے قبضے میں آگیا۔ اُس کی اندرونی زندگی کے آئین اور دستور منقلب نہیں ہوتے۔"

اِن واقعات کے معلوم کرنے کے بعد کون وہ شخص ہے جو اِس امر سے انکار کر سکتا ہے کہ اُس وقت ہندوستان کے تمام باشندے سیاسی اعتبار

---

[1] صفحہ ۱۹۶ ادت

ایک قوم تھے اُن میں مذہبی یا ملی اختلاف نہ تھے۔ انھیں اس امر کی کوئی پروا نہ تھی کہ اُن کا بادشاہ یا راجہ مسلمان ہے یا ہندو۔

ہندوستانیوں کی اسی وسیع الخیالی اور بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردانہ خیالات کا نتیجہ تھا کہ اہل یوروپ ہندوستان میں آکر اطمینان کے ساتھ رہے۔ ہندوستان کی تاریخ سے واضح ہے کہ ہندوستانی کبھی قوم یا مذہب کے اختلاف کی بنا پر انگریزوں سے نہیں لڑے جس طرح سے کہ آسٹریلیا اور امریکہ کے اعلیٰ درجہ کے مہذب لوگ کالے لوگوں کو اپنے ملک میں آباد ہونے سے روکتے ہیں۔ ہندوستانیوں نے کبھی اس طرح سے کسی کو نہیں روکا اور ہندوستان میں مختلف مذہبوں اور عقیدوں کے لوگ ملی جلی آبادیوں میں مثل عزیزوں اور رشتہ داروں کے امن کے ساتھ یکجا رہتے تھے۔ مگر جس بے رحمی کے ساتھ انگریز حکمرانوں کی ایک مخصوص جماعت نے ذاتی اقتدار اور ذاتی منافع کے لیے ہندوستان کی اس اجتماعی قومی حالت کو منتشر کیا ہے اس کی کوئی نظیر دنیا میں مشکل سے ملے گی اور واقعہ یہ ہے کہ اپنے اس طرز عمل سے نہ صرف ہندوستان کو بلکہ سلطنت برطانیہ کے نشو و نما کو صدمہ پہونچایا ہے۔ بے شک افلاس اس ملک کی بڑی مصیبت ہو گئی ہے مگر نفاق۔ خانہ جنگی اور بد امنی جو مذہبی بنا پر ہوا افلاس سے کہیں زیادہ بدتر ہے کیوں کہ وہ ملک کی ترقی میں ایک بڑی سد راہ ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حکومت رعایا میں نفاق ڈالے بغیر نہیں چل سکتی حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ حال میں اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ جب

شاہ افغانستان اپنی سیاحت سے واپس آئے تو سکھوں نے چاہا کہ وہ اپنا ایک وفد لے جا کر امیر صاحب کی خدمت میں مبارکباد پیش کریں۔ مگر شاہ افغانستان نے اُسے یہ کہہ کر نامنظور کر دیا کہ اُن کے نزدیک ہندو اور مسلمان سکھ اور عیسائی سب برابر ہیں اور وہ اس قسم کی ملی تفریقوں کو پسند نہیں کرتے۔ برخلاف اس کے انگریزی سلطنت کا نہیں بلکہ انگریزوں کی ایک جماعت کے اقتدار کا انحصار ہی اس امر پہ ہے کہ وہ کبھی ایک جماعت پہ دست شفقت پھیریں اور کبھی دوسری پر جس سے مختلف ملتوں میں قابت پیدا ہو اور وہ رقابت بڑھ کر حسد عناد اور مذہبی کشت وخون کی صورت اختیار کرلے۔

۲۳۔ نفاق پھیلانے کے طریقے | اب ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی مختلف اقوام میں مذہبی عناد کی بنیاد کب سے پڑی۔ جہاں تک ہمیں علم ہے ۱۸۵۷ء تک ملی اختلاف کا وجود نہ تھا۔ جب فوجوں میں ناراضی شروع ہوئی تو ہر مقام کے سپاہی اپنی چھاونی میں آگ لگا کر اور برباد کر کے دہلی کے معزول اور معطل بادشاہ کی طرف دوڑ پڑے۔ یہ سپاہی بہاں تک سے آئے تھے ان میں ہر مذہب وملت کے ہندوستانی تھے۔ ہندو سپاہی بہادر شاہ کی جے پکارتے تھے۔ اگر موجودہ زمانہ کے سے تعصبات اس وقت ہوتے تو مسلمان سپاہی مسلمان بادشاہ یا نواب کے پاس جاتے اور ہندو سپاہی کسی راجہ کے پاس جاتے۔ مگر سب کے سب بلا تفریق مذہب وملت کے معزول اور بے جان مسلمان بادشاہ کے گرد جمع ہو گئے۔ اس واقعہ سے یہ بھی ظاہر ہے

کہ جو ظلم وستم اور جبر وتعدی پچھلی سلطنتوں سے منسوب کیئے جاتے ہیں وہ نہ صرف غلط ہیں بلکہ حالت اس کے برعکس تھی ورنہ بادشاہ سے رعایا کی اس قدر دلگرویدگی کی سبب کہ اس کی سلطنت جاتی رہی تھی کوئی وجہ نہ تھی ۱۸۵۷ء کے افسوسناک واقعہ کے بعد بھی انگریزوں کا ایک گروہ تو مثل لارڈ کیننگ وائسرائے ہند کے سراسر ہندوستانیوں کی بہبودی کے کاموں میں مصروف رہا اور غیر جانبدارانہ حکومت کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر دوسرا گروہ ہنگامہ کے بہت قبل سے مختلف اصول کے تحت میں کام کررہا تھا۔ اس کا پتہ ایک چٹھی سے چلتا ہے جو لارڈ ایلنبرا گورنر جنرل ہند نے ۱۸۴۳ء میں ڈیوک آف ولنگٹن کو لکھی تھی۔ اس چٹھی میں تحریر ہے کہ "میں اس عقیدہ سے چشم پوشی نہیں کرسکتا کہ مسلمانوں کی قوم اصولاً ہماری دشمن ہے اس لئے ہماری حقیقی پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کی رضا جوئی کرتے رہیں۔"

(ان ہیپی انڈیا مصنفہ لالہ لاجپت رائے صفحہ ۳۹۹)

اس قسم کے خیالات سے معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ ایلنبرا کی قسم کے انگریز اس قدر کمزور تھے کہ مسلمانوں جیسے خوددار اور آزاد طبیعت لوگوں پر حکومت نہ کرسکتے تھے۔ انھیں چونکہ اپنی قوت پر بھروسہ نہ تھا اس لیے اپنی حفاظت کی غرض سے ہندوؤں کو گانٹھنے پر مجبور ہوئے۔ اسی قسم کی پالیسی کو لارڈ الفنسٹن گورنر بمبئی نے ۱۴ مئی ۱۸۵۹ء کو ایک یادداشت میں لکھا تھا کہ "نفاق ڈال کر حکومت کرنا رومیوں کا اصول تھا۔ اور یہی اصول ہمارا بھی ہونا چاہیئے" (ماخوذ از ان ہیپی انڈیا)

اور واقعہ یہ ہے کہ اسی خیال کی جماعت انجام کار غالب آئی اور نفاق کے بارہ میں ہندوستان کی وہ حالت ہوگئی جو ہم سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ نفاق پھیلانے کے اصول پر عملدرآمد کرنے کے لیے غالباً سب سے اوّل اسکولوں کے لیے ایسی تاریخیں انگریزی اور اُردو میں لکھائی گئیں جن میں مسلمان بادشاہوں کے مذہبی تعصبات اور مظالم کے حالات درج ہیں اور جس قوم نے کم وبیش آٹھ سو سال ہندوستان میں حکومت کی اور حکومت کے بعد رعایا کے دلوں پر ایسا گہرا نقش چھوڑا کہ غدر کے باغی پرانی سلطنت مٹ جانے کے بعد بھی برائے نام بادشاہ کے گرد جمع ہوگئے ایسی قوم کی مشکل سے کوئی خوبی ان تاریخوں میں دکھائی گئی۔

غدر کے بعد حکمراں جماعت کے جو خیالات مسلمانوں کے متعلق تھے وہ ہنری ہیرنگٹن طامس کی جو بنگال کے سویلین تھے تحریر سے جو انھوں نے ۱۸۵۸ء میں اپنے رسالہ موسومہ

"Late Rebellian in India

undr future Policy."

(ہندوستان میں گزشتہ بغاوت اور ہماری آیندہ پالیسی) میں درج کی ہے۔ ظاہر ہوں گے اور وہ یہ ہیں:۔

"میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بانی اور اصلی محرک ہندو نہ تھے اور اب میں یہہ دکھانے کی کوشش کرونگا کہ یہ غدر مسلمانوں کی سازش کا نتیجہ تھا۔ ہندو اگر وہ اپنی مرضی

اور ذرائع تک محدود ہوں تو وہ کسی ایسی سازش میں شرکت نہ کر سکتے تھے نہ کرنا چاہتے تھے ....

وہ (مسلمان) خلیفۂ اوّل کے وقت سے موجودہ زمانہ تک عیسائیت کے ساتھ مغرور، غیر روادار اور ظالم رہے ہیں ہمیشہ ان کا مقصد یہ رہا ہے کہ جس ذریعہ سے بھی ہو اسلامی حکومت قائم ہو۔ اور عیسائیوں کے ساتھ نفرت کے خیالات کی نشو و نما ہو۔ مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو اچھی رعایا نہیں ہو سکتے۔ اس لیئے کہ احکام قرآنی کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں "

غالباً اسی خیال کے انگریزوں نے غدر کے بعد مسلمانوں کو پھانسیاں دیتے ان کی جائدادیں ضبط کرنے اور ہر طرح انھیں برباد کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ سرسید احمد خاں صاحب مرحوم نے رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھنے کے علاوہ "وفادار مسلمانان ہند" میں مسلمانوں کی بے گناہی ثابت کی اس رسالہ کا کوئی اثر عملداری پر ہوا ہو یا نہ ہوا ہو مگر یہ ایک واقعی امر ہے کہ غدر کے بعد مسلمانوں پر اس درجہ مظالم ہوئے کہ اس نے مسلمانوں کو حد درجہ خائف اور بزدل کر دیا۔ ہر رعایا کا اخلاقی اور مذہبی فرض ہے کہ وہ پر امن زندگی بسر کرے اور عملداری کے خلاف بغاوتوں اور بلووں میں شریک نہ ہو۔ مگر وفاداری کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی وفاداری اس حد تک پہونچ گئی کہ گورنمنٹ کے نام سے بھی اُن کے حواس باختہ ہونے

لگے ۔ وہ غدر کے واقعات سے ایسے ڈر گئے تھے کہ اُنھوں نے جملہ سیاسی
تحریکات سے بھی دستکشی اختیار کر لی ۔ سیاسی تحریکات جو زمانۂ حال کے نظام
سلطنت کی جان ہیں وہ مسلمانوں کے نزدیک گورنمنٹ کی ناراضی کی مرادف
ہوگئیں اور جب مسلمانوں نے دیکھا کہ حکام وقت اُنھیں جداگانہ تعلیم اور جداگانہ
حقوق دینے کی طرف متوجہ ہیں تو اُنھوں نے اپنی قسمت کو در وبست اُن کے
ہاتھوں میں چھوڑ دیا ۔ حتیٰ کہ ۱۸۸۵ء میں جب مسٹر ہیوم نے لارڈ ڈفرن وائسرائے
ہند کے مشورہ سے اہل ہند کو سیاسیات کی تعلیم دینے کے لیے انڈین نیشنل
کانگریس قائم کی تو بجز چند مسلمانوں کے تمام چیدہ اور سربرآوردہ مسلمان جو
مسلّم طور پر اپنی قوم کے بہی خواہ تھے ملک کی سیاسی تحریکات سے کنارہ کش
رہے ۔ وہ سمجھتے تھے کہ شکایات کے اظہار کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ جداگانہ حقوق سے
محروم ہوجائیں گے جس سے اُن کا قومی نقصان ہوگا ۔ مگر ان جداگانہ حقوق
سے مسلمانوں کو کوئی نفع پہونچا ہو یا نہ پہونچا ہو اُس سے برادران وطن کے
دلوں میں مسلمانوں سے ایک قسم کی رقابت پیدا ہوگئی اور رقابت سے گزر کر
رنجش کی حد تک پہونچی ۔ اب برادران وطن کی طرف سے مخالفتیں شروع
ہوئیں جن میں حکام وقت مسلمانوں کی کچھ امداد نہ کرسکے اور ہندوؤں کی
بڑھتی ہوئی قوت سے دب گئے ۔ اس پر مسلمانوں نے بھی شور وشغب کیا ۔
مگر اُنھیں سیاسی امور کی چونکہ تربیت نہ ہوئی تھی اس لیے وہ مقابلہ کی تاب
نہ لاسکے اور اُس کا نتیجہ ایک کمزور اور بے دست و پا جماعت کے لیے جو ہونا
چاہیئے تھا وہ ہوا اور ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا جب تک کہ مسلموں اور

غیر مسلموں دونوں کی آنکھیں نہ کھلیں اور وہ یہ نہ سمجھیں کہ دونوں کی باہمی کشاکش سے بقول لارڈ میکالے کے ہندوستان کے خزانے سمندروں میں بہہ کر انگلستان چلے جا رہے ہیں۔

۳۳۔ مخلوط اور جداگانہ طریقۂ انتخاب کا مقابلہ

غرضکہ کبھی ایک قوم کو اور کبھی دوسری کو اُبھارنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں پوری جدائی اور بے اعتباری ہوگئی بے اعتباری ہوجانے کے بعد جب مخلوط انتخاب بغیر معیّن نشستوں کے دیا گیا تو اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اکثریت نے اقلیت کو مغلوب کرلیا جس سے مسلمانوں کو نقصان پہونچا۔ اس کا علاج ظاہر یہ تھا کہ مخلوط انتخاب کے ساتھ معین نشستیں کردی جاتیں تاکہ مسلمانوں کو بھی ہر انتخابی جماعت میں حسب رسد حصّہ مل جاتا۔

اُسی کے ساتھ گورنمنٹ نے بار بار اس امر پر زور دیا ہے کہ حکومت خود اختیاری ملنے کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ انتخابی جماعتوں میں مخلوط انتخاب جاری ہو۔

چنانچہ منٹو مارلے رپورٹ میں جو ۱۹۱۸ء میں مرتب ہوئی تحریر ہے کہ "ہم ہر قسم کے جماعتی انتخابات کو حکومت خود اختیاری کی ترقی کی راہ میں سخت رکاوٹ سمجھتے ہیں۔"

باوجود اس کے ملک میں جداگانہ انتخاب جاری کرکے مسلمانوں کو اور ملک کو تین قسم کے نقصانات پہونچائے۔ پہلا نقصان تو ملک کو یہ پہونچا کہ مخلوط انتخاب کی عدم موجودگی میں حکومت خود اختیاری کی اہلیت نہ رہنے

کی وجہ سے وہ میدان ترقی میں مدتوں کے لیے پیچھے ہٹ گیا۔
دوسرا نقصان مسلمانوں کو یہہ پہونچا کہ اُن کا اثر ہندوؤں پر سے بالکل اُٹھ گیا
اور ہندوؤں کی کثیر جماعت جو تعداد، دولت اور علم کے اعتبار سے زیادہ
قوی ہے۔ مسلمانوں سے بالکل مستغنی ہوگئی اور اُنھیں ہر طرح دبانے پر تُل
گئی۔ اور سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ دونوں قوموں میں مستقل عداوت
قائم ہوگئی جس کا انجام باہمی کشت و خون ہے۔ چنانچہ مسٹر کرٹس
Lionel Curtis. جو ایک مشہور ماہر سیاست ہیں اپنے خطوط
بنام باشندگان ہند میں لکھتے ہیں کہ :۔

"چند سال ہوئے جب کہ طریقۂ انتخاب جاری کیا گیا اُس وقت
اس رعایت (جداگانہ نیابت) کا دیا جانا انگریزی گورنمنٹ کی
سب سے بڑی غلطی تھی جو اُس سے ہندوستان میں سرزد
ہوئی ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر یہ اصول انتخاب جداگانہ
مستقل طور پر قایم ہوگیا۔ تو ہم ہندوستان میں ذات پات
کا ایک نیا طریقہ جاری کرنے کے باعث ہوں گے اور یہ وہ
طریقہ ہوگا جو ہندوستان کی زندگی کو سال بسال گھن کی طرح
کھاتا رہے گا۔ جب تک یہ طریقہ جاری رہے گا ہندوستان
کبھی قومیت کے لحاظ سے متحد نہ ہو سکے گا۔ اور جتنے عرصہ تک
وہ قائم رہے گا اُتنی ہی مشکل اس کے استیصال میں پیش آئیگی
نتیجہ یہ ہوگا کہ آخرکار اندرونی خانہ جنگی اُس کا خاتمہ کرے گی۔

ہم اس امر کے امین ہیں کہ ہندوستان کو اس قابل بنائیں کہ وہ متحد قومیت کا درجہ حاصل کرنے کے قابل ہو جائے - مگر فرقہ وارانہ نمایندگی کا طریقہ جاری کرنے سے میں سمجھتا ہوں کہ ہم نے اس امانت میں خیانت کی ہے یہاں کے لوگوں میں اس طریقۂ انتخاب نے اس قدر خراب اثر پیدا کر دیا ہے کہ فی الحال یکبارگی اس رعایت کا منسوخ کرنا ممکن نہیں معلوم ہوتا در آن حالیکہ آج سے چند سال پہلے اس کو نا منظور کر دینا آسان تھا - لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اگر ہم ایسے قواعد بنانے میں جن سے وہ زنجیریں جن میں ہندوستان جکڑا ہوا ہے ڈھیلی ہوتی ہوں ناکامیاب رہیں تو ہندوستان کے خلاف ہم ایک ناقابل معافی جرم کے مرتکب ہوں گے" (صفحہ ۱۱۲ و ۱۱۳ خطوط بنام باشندگان ہند)

مسٹر کرٹش کی یہ پیشین گوئی کہ جُداگانہ نیابت کا انجام Civil War اندرونی خانہ جنگی ہوتا ہے گزشتہ پانچ سال سے پوری ہو رہی ہے - اس عرصہ میں صرف صوبہ متحدہ میں نوے بلوے ہوئے جن میں اکیاسی اشخاص مقتول اور ۲۳۰۰ - اشخاص زخمی ہوئے - کاش اس سے صدہا گونہ صرف جوان العمر اشخاص دونوں طرف سے میدانوں میں نکل کر مردانہ وار لڑائیاں لڑتے اور خوب مرتے اور زخمی ہوتے تو اس سے فریقین میں بہادرانہ جنگ کی قابلیت پیدا ہوتی جو ملکی حفاظت کے وقت دونوں فرقوں کے لیے

کارآمد ثابت ہوتی۔ مگر موجودہ جنگ ظالمانہ ہونے کے ساتھ ایسی بزدلانہ ہے جس میں پُرامن زندگی بسر کرنے والے بوڑھے مرد اور عورتیں اور کمزور معصوم بچے اپنی گلیوں اور اپنے گھروں میں ذبح کئے جاتے ہیں اور جس سے تمام ملک بجائے بہادری کے بزدلی کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ یہ اس عملداری پر ایک بدنما دھبہ ہے جو اپنے کو دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور سلطنت ہونے کا اعلان کرتی ہے۔ جو ہندوستان میں امن قائم کرنے کی مدعی ہے۔

اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جن ممالک میں مخلوط انتخاب کے ساتھ حکومت خود اختیاری ملی ہوئی ہے وہ بھی باہمی اختلافات اور جنگ و جدل سے کلیتاً پاک نہیں ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ وہاں مختلف پارٹیاں جو آپس میں لڑتی رہتی ہیں وہ سیاسی جماعتیں ہیں جن کے لڑنے میں بھی ملک سیاسی اقتصادی اور مادی اعتبار سے ترقی کرتا جاتا ہے۔ جیسی کہ کنیڈا کی نوآبادی کی حالت ہے۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں جہاں جداگانہ انتخاب کا نفاذ ہے ملی اور مذہبی پارٹیاں ہیں۔ یہ ملی اور مذہبی پارٹیاں لغو اور لایعنی غیر مفید بلکہ مضر امور پر لڑ لڑ کر اپنی قوت ضائع اور زائل کرتی رہتی ہیں اور تمدن و معاشرت کے اعتبار سے روز بروز گرتی چلی جاتی ہیں۔ اور حقیقی اور اصلی مقصد ترقی سے دور ہوتی جاتی ہیں مثلاً ہندوستان کی ملی پارٹیاں جن مشاغل میں مصروف ہیں اُن کی تفصیلات یہ ہیں۔

۳۴۔ زبان کا مسئلہ | مثلاً جب ہندوستان میں اس صدی کے شروع میں۔ طاعون کا بہت زور تھا اور شہروں میں سے لوگوں کو اٹھا کر باہر جھونپڑیوں

میں رہنے پر مجبور کیا جاتا تھا تو اکثر مقامات پر ہندو مسلمانوں نے مل کر عملداری کے خلاف بلوے کئے تھے۔ اپریل سنہ ۱۹۰۰ء میں کانپور میں جب اس قسم کا بلوہ ہوا تو سر انیٹونی میکڈانل لفٹننٹ گورنر صوبہ متحدہ وہاں تشریف لے گئے اور حالات کا ملاحظہ فرما کر واپس گئے اور ایک ہفتہ کے اندر ایک گشتی حکم اس مضمون کا جاری فرمایا کہ عدالتوں اور کچہریوں میں ہندی حروف میں لکھی ہوئی درخواستیں لی جا سکیں گی۔ اس حکم پر ہندوؤں کی طرف سے گورنمنٹ کے شکریہ کے جلسے اور مسلمانوں کی طرف سے گورنمنٹ سے اظہار ناراضی کے جلسے منعقد ہونے لگے اور ہندو مسلمانوں میں جدائی ہو گئی اور وہ جدائی رفتہ رفتہ اس مرتبہ پر پہونچ گئی کہ مسلمان ہندی حروف سے اور ہندو اردو حروف سے نفرت ظاہر کرنے لگے حالانکہ ہندی اور اردو دونوں اسی ملک کی پیداوار ہیں برخلاف اس کے دونوں کو آٹھ ہزار میل دور کی زبان یعنی انگریزی سے رغبت یہ ہمارے حکمرانوں کی رجعت پسند۔ Reactionary جماعت کی انتہائی کامیابی ہے۔

۳۵۔ دیگر مختلف فیہ مسائل | دوسرے مشاغل جن میں تمام ملک مصروف ہے وہ باجہ اور قربانی کے اختلافات ہیں جن کو غیر ممالک کے لوگ سن کر یقین بھی نہیں کر سکتے۔ جو ملک دولتمندی میں نمبر اوّل سے گر کر افلاس میں نمبر اوّل ہو گیا ہو جس ملک کی فی کس آمدنی متمدن ممالک کے سولھویں حصہ سے بھی کم رہ گئی ہو جس ملک کا "باغ ارم" اجڑ کر وہاں صحرا بن گیا ہو، جس ملک میں پچاس فی صدی انسانوں کو پیٹ بھر کھانا اور بدن ڈھکنے کو کپڑا نہ ملتا ہو، جو مردم شماری کے

اعتبار سے دنیا میں دوسرے نمبر پہ آ گیا ہو مگر اہمیت کے اعتبار سے دنیا کے ممالک کی فہرست میں اخیر میں پہونچ گیا ہو، ایسے ملک کے بہترین دل و دماغ اپنی ملکی ترقی کے مسائل کو چھوڑ کر قربانی اور باجہ اور کشت و خون میں مصروف رہنے اور ان کے متعلق مقدمات میں پیروی کرنے اور اس میں لاکھوں روپیہ صرف کرنے کو بہترین کام سمجھتے ہوں، یہ باتیں متمدن ممالک کے لوگوں کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آسکتیں۔

باب ششم

اہل ہند کی زندگی کے مختلف پہلو

۳۶- اہل ہند میں اعلیٰ عہدوں کی قابلیت

اب ہم مختصر طور پر دکھانا چاہتے ہیں کہ اُن امور میں جن پر حقیقی طور پر ملکی ترقی کا دار و مدار ہے۔ اس وقت ہم کس مرتبہ اور کس منزل میں ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ دُنیا میں جن پیشوں پر انسان کی معاش کا زیادہ تر دار و مدار ہے وہ صنعت و حرفت اور زراعت ہیں۔ مگر موجودہ حالات میں ہندوستان میں ان پیشوں میں کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ البتہ سب سے زیادہ جس پیشہ میں کشش پیدا ہوگئی ہے وہ ملازمت کا پیشہ ہے۔ فقرہ ۱۸ میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ سر ولیم ہنٹنگ۔ کو جو

ہندوستانیوں کے بڑے بہی خواہ تھے بڑے عہدے دینے کی طرف خاص
توجہ تھی تاہم وہ اپنے زمانہ میں بڑی سے بڑے عہدے جو ہندوستانیوں کو
دے سکے وہ صدر امانت اور منصفی کے عہدے تھے۔ پھر ۱۸۳۳ء میں
پارلیمنٹ کا قانون پاس ہوا کہ گوروں اور کالوں سب کو اُن کی قابلیت
کے مطابق مساوی عہدے دیے جائیں گے۔ مگر بیس سال بعد معلوم ہوا
کہ اگرچہ بقول سر ارسکائن پیری کے "ہندوستانی جج بمقابلہ نیٹی کے
ججوں کے بہت زیادہ اچھی تجاویز لکھتے تھے" تاہم جو تنخواہ ہندوستانیوں کو
ملتی تھی وہ انگریز ججوں کی تنخواہوں کے صرف پچیسویں حصہ کے قریب
ہوتی تھی۔

۷۳۔ ملازمت میں کشاکش غرضکہ ملازمت کے اعتبار سے ہندوستانیوں
کی یہی پست حالت رہی حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء میں غدر ہوا اور غدر کے بعد
۱۸۵۸ء میں پھر اس شاہی اعلان کا اعادہ کیا گیا جس کا مضمون یہ تھا کہ ہر قوم
وملت کو بہ لحاظ اُن کی قابلیتوں کے یکساں عہدے دیئے جائیں گے۔ مگر اس
پر بھی کبھی عملدرآمد نہ ہوا۔ حتیٰ کہ گورنمنٹ کے پہلے اعلان کے پچانوے سال
بعد اس وقت بقول لالہ لاجپت رائے صاحب کے نوسو روپیہ سے
ایک ہزار روپیہ تک کے عہدوں پر کل چار فی صدی ہندوستانی مقرر
ہیں۔ باقی ماندہ ۹۶ فی صدی عہدوں میں سے چار فی صدی پر اینگلو انڈین
اور بانوے فی صدی پر خالص یوروپین فائز ہیں۔ حالانکہ وہی ہندوستانی
جو انگریزی عملداری میں نالائق قرار دیئے گئے ہیں ہندوستانی ریاستوں میں

وزارت اور مدار المہامی کی خدمات کے کام خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں اور باوجودیکہ مذہبی اختلافات اور تعصبات کی سمی ہوا جو انگریزی علاقہ میں پیدا کی گئی تھی ریاستوں تک پہونچ چکی ہے تاہم وہاں مسلمان ریاستوں میں ہندو مدار المہام اور ہندو ریاستوں میں مسلمان مدار المہام موجود ہیں۔ مگر انگریزی علاقہ میں رجعت پسند اصحاب کو تفرقہ ڈالنے میں اس قدر کامیابی ہوئی ہے کہ مختلف فرقوں کے لوگوں میں شب و روز جوتی پیزار رہتی ہے۔ اس جوتی پیزار رہنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ زمانہ سابق میں ہر پیشہ میں تقسیم عمل کا اصول جاری تھا حتیٰ کہ ہندوؤں کی ذاتیں ہی اقتصادی اصول پر بنائی گئی تھیں۔ اور جس پیشہ کو جو گروہ اختیار کرتا تھا وہی اُس کی ذات ہو جاتی تھی۔ جب مسلمان اس ملک میں آئے تو اُن کی تقسیم بھی ایک حد تک اسی طرح عمل میں آئی اور اُن میں سے زیادہ تر لوگوں نے ملازمت کا پیشہ اختیار کیا اس طرح مسلمان ہر صوبہ کی ملازمتوں میں زیادہ تعداد میں تھے اور اسی طرح ہندوؤں کی بھی بعض ذاتیں ملازمت پیشہ تھیں۔ مثلاً صوبہ متحدہ میں کایستھ اور کشمیری برہمن ملازمت پیشہ تھے۔ مگر جب ہندوستان کی دولت کثیر مقدار میں کھنچکر باہر چلی گئی اور ہندوستان کے تیار کردہ مال پر بہت سے محصولات لگائے اور ہندوستان کی صنعت و زراعت میں تنزل ہوا اور سرکاری عہدوں کی تنخواہیں غیر معمولی طور پر زیادہ بڑھ گئیں تو اس نے ذاتوں کی تمام حدود کو توڑ ڈالا اور ہر فرقے کے لوگ بے تحاشا ملازمتوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان ملازمتوں سے خارج ہونے لگے۔ اور چونکہ ملازمت پیشہ مسلمان اپنے کو دفعتاً دوسرے

پیشوں کے حسب حال نہ بنا سکے اس لیے اُن کی حالت بہت جلد خراب ہوگئی۔ مگر اس تمام کشمکش میں اعلیٰ ملازمتوں کے عہدے بالکل محفوظ رہے۔ اور کبھی کسی کو اس طرف توجہ بھی نہ ہوئی کہ ہندوستانیوں کی راہ میں جو رُکاوٹیں اس بارہ میں تھیں اُنھیں دور کرتا۔ اور دور بھی کیسے کر سکتا جبکہ ملک کی تمام قوت انگلستان کے ووٹروں کے ہاتھوں میں تھی۔ گویا بڑے عہدوں پر ہندوستانی صرف اس طرح پہونچ سکتے تھے کہ ہندوستان کے رائے دہندوں کی قوت میں اضافہ کیا جاتا۔ اسی مضمون کے متعلق اخبار پانیر مورخہ ۲۰ جولائی ۱۹۳۵ء کے ایک مضمون میں تحریر تھا۔

"لیکن ملکی عہدوں پر ہندوستانیوں کے تقرر کا اصل منشا سول سروس والے کبھی نہیں سمجھتے یا سمجھتے ہیں تو ادھورا۔ اکثر وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ دیگر نوآبادیات کا سا مرتبہ حاصل کرنے کے لیئے جو قدم بڑھایا جائے گا وہ اُن کے مخصوص حقوق پر حملہ ہوگا اور اُن ملازمتوں کی تعداد کم کر دے گا جو پہلے اُن کے لیئے حاضر رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ایک مقدس امانت نا اہل جانشینوں کے ہاتھ میں پہونچ جائے گی۔ اور یہ خیال ہر اُس جماعت کے ذہن میں قدرتی طور پر پیدا ہونا چاہیئے جو بہ تدریج برطرف ہو رہی ہو۔ اگر ایسا ہوتا کہ جس وقت ملکی عہدوں پر ہندوستانیوں کے تقرر کا آغاز ہوا تھا اُس وقت سول سروس والے اپنے آپ کو فن حکومت کا اوستاد اور معلّم خیال کرتے تو اس درجہ نزاع اور رنجش جواب سے ہرگز پیدا نہ ہوتی۔"

غرض کہ ایک طرف تو ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان

ملازمتوں میں کشمکش ہے دوسری طرف محدود عہدے ہونے کی وجہ سے امیدواروں کی مشکلات ہیں۔ سر پی۔ سی رائے نے ایک اسپیچ میں بیان کیا تھا کہ بنگال میں کسی ایک سال میں پندرہ ہزار طلباء میٹرک پاس ہوئے جن میں سے نو ہزار یونیورسٹیوں میں داخل ہوئے۔ اُن میں سے صرف پانچسو ایم اے ہوئے۔ ان پانچسو میں سے صرف پچاس کو اچھے عہدے ملے باقی ماندہ ۴۵۰ کو صرف پچاس روپیہ ماہوار تک کی نوکریاں ملیں۔ اس حساب سے جتنے طلباء یونیورسٹیوں میں داخل ہوئے اُن میں ۱۸۰ میں سے صرف ایک شخص کو اچھی نوکری ملی۔ باقی ماندہ ۱۷۹ پریشان حال رہے۔ سر پی۔ سی رائے نے فرمایا کہ انگلستان میں جس قدر لڑکے میٹرک پاس کرتے ہیں اُن میں سے صرف دس فی صدی یونیورسٹیوں میں داخل ہوتے ہیں۔ کیونکہ اسکول کی تعلیم سے وہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کرلیں۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں میٹرک پاس شدہ طلباء میں سے ۶۰ فی صدی یونیورسٹیوں میں جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اس قدر تعلیم حاصل کرنے کے بعد اُنھیں کوئی مفید اور کارآمد ہنر نہیں آتا مگر ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ اگر اُنھیں کوئی صنعت وحرفت بھی سکھادی جائے تب بھی وہ ہندوستان میں سرمایہ کی کمی کی وجہ سے کسی کام میں کامیاب نہیں ہو سکتے اور نوکریاں تلاش کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ بہرحال ملک کے لوگوں کی ایک کثیر جماعت ادنیٰ نوکریوں کی تلاش میں حیران اور سرگرداں پھرتی رہتی ہے۔ اور جن لوگوں کو ملازمتیں مل جاتی ہیں وہ دفتروں میں پہونچ کر دوسرے فرقہ والوں کو

تنگ کرتے ہیں۔ آگے بڑھنے میں مزاحمتیں پیدا کرتے ہیں جن کی تفصیلات میں اخبارات کے کالم پر ہوتے ہیں۔ اور ان مضامین سے جو تمیزت پیدا ہوتی ہے وہ تمام ملک میں پھیل کر مختلف فرقوں میں رنجشیں پیدا کرتی ہے۔ اور اوبعض ملک کے اہم امور میں متحد نہیں ہونے دیتی۔ جس سے رجعت پسند جماعت کا منشاء پورا ہوتا ہے۔ اور ناظرین کو یہ معلوم ہوکر تعجب ہوگا کہ یہ تمام فضیحتے ہندوستان کی ایک نہایت "قلیل تعداد سے متعلق ہیں۔ کیونکہ ہر قسم کے ملازمت پیشہ لوگوں کی تعداد اس ملک میں صرف ۰،۲ فی صدی یعنی ایک فی صدی سے بھی کم ہے۔ مگر اس "قلیل التعداد لوگوں کے باہمی اختلافات کا اثر ہندوستان کے دوسرے نفع آور پیشوں پر بھی پڑتا ہے جن میں ملک کی آبادی کا زیادہ حصہ مصروف ہے۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ملک کی عام ہوا مکدر ہونے کی ابتداء ملازمتوں اور دفاتر سے ہوئی جو تعلیم یافتہ اور خواندہ لوگوں کے ذریعہ سے پھیل کر ہر شعبۂ زندگی تک پہونچ گئی۔ اس سے ہماری یہ غرض نہیں کہ مظلوم قلیل التعداد جماعتیں جن کی ملازمتوں میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں وہ گورنمنٹ سے رجوع نہ کریں۔ بلکہ ہمارا منشاء صرف یہ ہے کہ ساتھ کے ساتھ وہ گورنمنٹ سے اس امر کا بھی تو زیادہ زور کے ساتھ مطالبہ کریں کہ ہندوستانیوں کے لیئے تمام بڑے عہدوں کے دروازے آزادی کے ساتھ کھول دیے جائیں جب تمام بڑے عہدے ہندوستانیوں کے لیے کھول دیے جائیں تو قلیل جماعتوں کو

اگر حصہ رسد نہیں تو کم سے کم کچھ عہدے تو ملیں ہی گے۔ مگر جو چیز ۱۸۳۳ء سے اس وقت تک جس کو پچانوے سال ہوئے۔ باوجود متواتر اعلانات شاہی کے نہیں ملی وہ محض جداگانہ عرض داشتوں سے تو نہیں مل سکتی البتہ جس نسبت سے اہل ہند کے رائے دہندوں کی قوت بڑھ رہی ہے اور مختلف شعبہ جات منتقل ہو کر اُن کے ہاتھوں میں آتے جاتے ہیں اُسی نسبت سے ملازمتوں میں اُن کا حصہ بڑھتا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جملہ فرقہ ہائے اہل ہند کو اگر اعلان شاہی پر عملدرآمد کرانا اور ملک کے بڑے عہدے حاصل کرنا ہے تو وہ متفق ہو کر گورنمنٹ سے مطالبہ کریں کہ مثل میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے جملہ صیغہ جات اہلِ ہند کے ہاتھوں میں دے دیئے جائیں تاکہ جملہ ملازمتوں کا دروازہ بجابیت کے ساتھ ہندوستانیوں پر کھل جائے

۸۳۔ ہندوستان کے ملازموں کی بڑی تنخواہیں | موجودہ سلسلہ ملازمت کے متعلق ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ انگریزوں کی وجہ سے اعلیٰ عہدوں کی تنخواہیں اس قدر زیادہ ہیں کہ اس بارہ میں دنیا کے دولتمند ترین ممالک بھی اس غریب ملک کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بعض صورتوں میں محکمہ کے ایک افسر کو اس قدر تنخواہ ملتی ہے کہ تمام اُس کے ماتحتوں کی تنخواہ مل کر بھی اُس کی برابر نہیں ہوتیں۔ ان بڑی تنخواہوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر شخص کے دل میں یہ امنگ پیدا ہو گئی ہے کہ جس طرح بن پڑے اعلیٰ عہدے حاصل کر لے اور اگر وہ عہدہ نہیں ملتا تو اُس کی زندگی تلخ اور بے لطف ہو جاتی ہے

گویا ہزاروں آدمی نوکری کے سٹہ میں مصروف رہتے ہیں۔ جن میں سے ایک فی ہزار بھی کامیاب نہیں ہوتے۔ اگر عہدے خود اہل ہند کے ہاتھوں میں ہوں تو اُن کی تنخواہیں ملک کی عام مالی حالت اور دوسرے پیشوں کی آمدنی سے زیادہ ہرگز نہ ہوں گی جیسا کہ تمام یورپین ممالک کی حالت ہے، اور اس سے ہر شخص کے دماغ میں ملازمت کا سودا پیدا نہ ہوگا۔ محکمۂ زراعت کے ایک افسر نے ایک بار اپنی تقریر میں بیان کیا کہ اُنھوں نے ہالینڈ کے زراعتی کالج میں طلبا سے دریافت کیا کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد کیا پیشہ اختیار کروگے سب لڑکوں نے کہا "کھیتی"۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں ہر زرعی طالب علم کے دماغ میں ملازمت کا خبط ہے اس پر سامعین میں سے ایک شخص نے اُس افسر سے کہا کہ آپ تو فن زراعت کے ماہر ہیں۔ آپ ملازمت چھوڑ کر کاشتکاری کا پیشہ کیوں نہیں اختیار کرلیتے۔ اس کا جواب بجز سکوت کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ کیونکہ تنخواہ کے علاوہ اُس افسر کو الاؤنس اس قدر زیادہ ملتا تھا کہ بقدر اُس کے بھی وہ ہندوستان کی زراعت میں پیدا نہ کرسکتے تھے۔

اس سلسلہ میں ایک پر لطف امر بیان کرنے کے قابل یہ ہے کہ ایک طرف تو ہندوستان کا افلاس بڑھ رہا ہے دوسری طرف اعلیٰ عہدوں کی تنخواہوں میں مسلسل اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ لالہ لاجپت رائے مرحوم نے اپنی کتاب ان ہیپی انڈیا میں ایک نقشہ دیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لی کمیشن نے اعلیٰ عہدہ داروں کی تنخواہوں میں جو اضافہ سال بہ سال کے لیئے تجویز کیا ہے

اُس کی رو سے پہلے سال کا اضافہ بقدر ایک کروڑ کے ہوتا ہے - برخلاف اس کے گریجویٹ اور ایم اے پاس کلرکوں کو جو کچھ ملتا ہے وہ اگرچہ اُن کے بچوں کی سکول فیس کے لیے بھی کافی نہیں ہوتا تاہم اُس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی - ایک اعلیٰ افسر جو اس نادار ملک میں دو ہزار روپیہ پاتا ہے اُس کی تنخواہ میں صدہا روپیہ کا اضافہ ضروری سمجھا جاتا ہے - برخلاف اس کے ایک چپراسی جو مدتوں سے ساڑھے دس روپیہ ماہوار پا رہا ہے باوجود گرانی کے اُس کے لیے یہ قلیل رقم کافی قرار دی گئی ہے - اِن حالات میں صرف اُس وقت تبدیلی ہو سکے گی جب کہ عوام کو ووٹ کی قوت عطا کی جائے - سوئٹزرلینڈ کا یہ ایک واقعہ ہے کہ وہاں سرکاری ملازموں نے درخواست دی کہ اُنھیں اور ممالک کی طرح پنشن کا حق دیا جاوے - اس پر وہاں کے مزدوروں اور کاریگروں نے کہا کہ ہم مدت العمر کام کرتے کرتے مرے جاتے ہیں - ہمیں بڑھاپے میں کونسی پنشن ملتی ہے - پھر کوئی وجہ نہیں کہ سلطنت کے ملازموں کو پنشن کی نعمت عطا کی جائے - چنانچہ وہاں کی پارلیمنٹ نے جس میں مزدوروں کے ووٹ شامل تھے درخواست مسترد کر دی - اسی طرح ایک پروفیسر صاحب سے جو حال ہی یورپ کا سفر کر کے آئے ہیں ہمیں معلوم ہوا کہ روس کے پریسیڈنٹ کو جو وہاں کا سب سے بڑا افسر ہے کُل تین سو روپیہ ماہوار ملتے ہیں - جب وہ لیگ آف نیشن کے جلسہ میں شرکت کے لیے جانے لگا تو اُس کے پاس اس جلسہ کے حسب حال کوئی ٹوپی نہ تھی - اس لیے سلطنت کی طرف سے خرید کر دی گئی - یہ امور ممکن ہے کہ اُن اصحاب کو جو ملازمت پیشہ یا پنشن خوار ہیں ناگوار ہوں مگر

کل ملک کا نفع اسی میں ہے کہ اعلیٰ عہدوں کی تنخواہیں ملک کی مالی حالت کے مطابق ہوں اور مالی حالت کی ترقی کے مطابق اُن میں اضافہ کیا جائے۔ خلاصہ یہ کہ ہر مذہب و ملت، ہر فرقہ اور جماعت کے لوگوں کا خواہ وہ اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں ملک کے مشترک مقاصد میں شریک ہو کر سلطنت سے مطالبات کرنا سب سے زیادہ اہم اور ضروری امر ہے اس کی مثال انجمنہائے امداد باہمی کی ہے کہ جو نفع کل جماعت مل کر حاصل کرتی ہے وہ لوٹ کر ہر ہر فرد تک حصہ رسد پہونچتا ہے۔ ان وجوہ سے مسلمانوں کو متحدہ مطالبات کی کوآپریٹو سوسائٹی میں شریک ہونا لازمی ہے اور ضروری ہے جس کے بغیر اُن کی قومی زندگی قائم نہیں رہ سکتی۔

۳۹ - ہندوستان صنعتی ملک سے زرعی ملک بنا دیا گیا | ہندوستان کے موجودہ حالات کے اعتبار سے ملازمت کے بعد دوسرے پیشے صنعت و تجارت اور زراعت ہیں۔ ہماری حکمراں جماعت کے بعض اصحاب یہہ کہتے ہیں کہ ہندوستان ہمیشہ سے محض ایک زرعی ملک رہا ہے۔ حالانکہ گزشتہ صفحات میں بہ کثرت انگریزوں کے اقتباسات دیئے گئے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان کی صنعت زمانہ سابق میں کس درجہ پر رہی ہے اور وہ کس طرح توڑی گئی۔ تاہم اُن تحریرات پر میں چند امور کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ نواب مرزا یار جنگ صاحب چیف جسٹس حیدرآباد دکن نے کپتان الگزنیڈر ہمیلٹن کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے کہ وہاں صرف ایک شہر کے مختلف کارخانوں میں پچاس[1] ہزار پارچہ باف کام کرتے تھے اور جو سامان تیار ہوتا تھا اُس کا

[1] ہند عہد اورنگ زیب میں صفحہ ۱۳۸

جزو اعظم بیرونی ممالک کو بالخصوص یورپ کو جاتا تھا۔ برخلاف اس کے یورپ سے جو مال آتا تھا وہ نہایت کم تھا۔ مثلاً ۱۷۹۴ء کی نسبت معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان میں انگلستان سے صرف ۱۵۶ پونڈ یعنی دو من کے قریب کپڑا آیا۔ پروفیسر ولسن نے لکھا ہے کہ "لوہا ڈھالنے کی صنعت اس ملک (انگلستان) میں صرف چند سال سے ہے۔ ہندی لوہا ڈھالنے کی صنعت اور اسپات بنانے کا کام نامعلوم زمانہ سے جانتے ہیں" مسٹر رانا ڈے نے ۱۸۸۲ء میں لکھا تھا کہ "دہلی کی مشہور لوہے کی لاٹھ جو پندرہ سو سال پرانی ہے۔ اس سے لوہا ڈھالنے کی صنعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مسٹر بال کو جو ہندوستان کے محکمۂ پیمائش کے افسر رہے ہیں تسلیم ہے کہ چند سال پہلے تک دنیا کے سب سے بڑے کارخانوں میں اتنی بڑی لاٹھ کا ڈھالنا ناممکنات سے تھا۔ اور اب بھی بہت کم کارخانے ایسے ہیں جو اتنی کثیر مقدار دھات کو ڈھال سکتے ہیں"۔ ایک اور مصنف کا بیان ہے کہ لندن میں فولاد ہندوستان کے نام سے فروخت کیا جاتا تھا۔ مسٹر ڈگبی نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں جہاز سازی نہایت اعلیٰ درجہ کی حالت میں تھی مگر انگریز اُسے گوارا نہ کر سکے۔ مسٹر ٹیلر نے لکھا ہے کہ "لندن کی بندرگاہ میں جب ہندوستان کا مال ہندوستان کے بنے ہوئے جہازوں میں پہونچا تو اس سے وہاں کے بااختیار لوگوں میں اس قدر سخت پریشانی پھیلی کہ کسی دشمن کے بیڑے سے بھی نہ پھیلتی۔ لندن کے جہاز سازوں نے اس شور و غوغا کرنے میں نمایاں حصّہ لیا اور کہا کہ ہمارا کاروبار برباد کی

کنارے آلگا ہے اور ہمارے بال بچے یقیناً فاقہ کشی میں مبتلا ہو جائینگے۔"
اِس چیخ پکار سے ڈائرکٹران کمپنی پر اثر پڑا اور اُنھوں نے جہاز سازی کی
صنعت ہندوستان کی بندرگاہوں سے توڑ کر انگلستان کی فاقہ کشی کے
خطرہ کو ہندوستان کی طرف روانہ کر دیا۔

ان کھلے ہوئے واقعات کے باوجود آج بڑے زور وشور کے ساتھ
یہ تبلیغ کی جاتی ہے کہ ہندوستان اصل میں زراعت پیشہ ملک ہے۔
حالانکہ سنہ ۱۸۲۳ء میں مسٹر ہنری سینٹ جارج ٹکر جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے
ڈائرکٹروں میں سے تھے کہتے ہیں کہ :-

"ہندوستان پہلے صنعت وحرفت کا ملک تھا مگر اب زراعت
پیشہ بنا دیا گیا ہے"۔

اِس کے علاوہ سنہ ۱۸۴۰ء میں سمپورہ کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے
مسٹر ایڈ ریوسم نے بیان کیا تھا کہ ہندوستانیوں پر اور پیشوں کے دروازے
بند کر دیے گئے تو وہ زراعت کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ اِن کے برخلاف
جان رچرڈ گرین نے لکھا ہے کہ :-

"انگلستان میں لوگ زیادہ تر زراعت کا کام کرتے تھے"
اور جارج فلپ۔ ایف۔ آر۔ جی۔ ایس لکھتا ہے کہ :-

"اگرچہ برطانیہ میں تمام ضروری اشیاء اور بالخصوص کوئلے کا ذخیرہ
کافی موجود ہے، پھر بھی سترہویں صدی کے آخر تک یہاں کے رہنے والے زیادہ تر

لہ (ماخوذ از رپورٹ صنعتی کمیشن صفحہ ۲۹۹)

کاشتکاری پر بسر کرتے تھے۔ ۱۷۵۰ء میں لندن اور ایڈنبرا کو چھوڑ کر صرف پانچ شہر اور تھے جن کی مردم شماری دس ہزار سے زیادہ تھی اور مصنوعات میں اگر کوئی خاص چیز تھی تو وہ ویلیٹ شائر، نارفوک اور یارک شائر کا ادنی کپڑا تھا۔ مگر اٹھارہویں صدی میں صنعت و حرفت میں جو زبردست انقلاب ہوا اس کے بعد زراعت اتنی عام نہ رہی اور صنعت و حرفت کے اعتبار سے انگلستان دنیا میں سب سے آگے بڑھ گیا۔"

مذکورۂ بالا قول میں اگر اتنی ترمیم کر دی جائے کہ صنعت و حرفت کے انقلاب کے بعد نہیں بلکہ ہندوستان میں برطانیہ کا دور حکومت شروع ہونے کے بعد انگلستان کو یہ ترقی نصیب ہوئی تو ہمارے نزدیک کسی قسم کی غلط بیانی نہ ہوگی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ صنعتی انقلاب بغیر کثیر سرمایہ کے محض ایجادوں کے ذریعہ سے ہرگز ظہور پذیر نہ ہو سکتا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ انگلستان میں سرمایہ کہاں سے آیا۔ اس بارہ میں مسٹر ڈگبی نے مسٹر بروک ایڈمس کی کتاب موسومہ "قانون تہذیب اور تنزل" کے حوالہ سے صاف اور صریح الفاظ میں لکھدیا ہے کہ :۔

"معرکۂ پلاسی کے بعد ہی بنگالہ کی دولت لٹ لٹ کر لندن پہونچنے لگی اور اُس کا اثر فوراً ہی ظاہر ہو گیا۔ کیونکہ ماہران فن سب اس امر پر متفق ہیں کہ "صنعت و حرفت کا انقلاب" ۱۷۶۰ء سے شروع ہوا۔ بقول بینز کے ۱۷۶۰ء سے پہلے لنکا شائر میں سوت کاتنے کے جو چرخے رائج تھے وہ ایسے بھدے سادے ہوتے تھے جیسے ہندوستانی چرخے۔

ایجاد بجائے خود ایک بے جان چیز ہے۔ بہت سی اہم ایجادات صدیوں تک دبی پڑی رہیں اور جب تک انھیں حرکت دینے والی قوت پیدا نہ ہوگئی وہ دنیا کے سامنے نہ آ سکیں یہ قوت ہمیشہ روپیہ سے فراہم ہوتی ہے ... صنعت و حرفت میں انگلستان کی برتری کرناٹک اور بنگال کے خزانوں کا فیض ہے جو اُس وقت انگریزوں کے فائدے کے لیے حاضر تھے پلاسی کی جنگ فتح ہونے سے پہلے جب کہ سونے کا دریا انگلستان کی طرف بہنا شروع نہ ہوا تھا۔ ہماری صنعت و حرفت کا بازار ٹھنڈا تھا۔ چرخوں کے لحاظ سے سوت کاتنے اور کپڑا بننے میں لنکا شائر کو ہندوستان پر کوئی فوقیت حاصل نہ تھی۔ البتہ وہ دستکاری جس نے ہندوستانی کپڑے کو صناعی کا عجوبہ بنا رکھا تھا۔ لنکا شائر کیا، مغرب میں کہیں بھی موجود نہ تھی۔ جو حال روئی کا تھا وہی لوہے کا بھی تھا۔ کان کنی اور آہن گری دونوں کام انگلستان میں بہت معمولی رفتار سے چل رہے تھے" (انڈسٹریل رپورٹ صفحہ ۳۰۲ نوٹ پنڈت مدن موہن مالوی صاحب)

۴۰۔ ہندوستان کے سرمایہ سے انگلستان کے کارخانے ان واقعات سے عیاں ہے کہ انگلستان میں پہلے نہ صنعت تھی اور نہ مشینیں تھیں اور نہ کاریگر ہوشیار تھے۔ جب ہندوستان سے مال غنیمت وہاں افراط سے پہونچا تب مشینیں تیار کی گئیں اور کارخانے قایم کیے گئے مگر لطف یہ ہے کہ بے شمار سرمایہ اور عظیم الشان کارخانوں کے باوجود بھی ہندوستان کا مال انگلستان جا کر سستا بکتا رہا اور انگلستان کے تیار کردہ مال کو شکست دیتا رہا۔

حتیٰ کہ گورنمنٹ برطانیہ مجبور ہوئی کہ ہندوستان کے مال کو روکنے کے لیے انگلستان میں سخت محصول لگائے جیسا کہ حسب ذیل تحریر سے ظاہر ہوگا۔

ایچ ایچ ولسن جو ہندوستان کا مورخ ہے لکھتا ہے کہ:-

"ایک شہادت کے دوران میں ۱۸۱۳ء میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے بنے ہوئے سوتی اور ریشمی کپڑے اُس وقت تک برطانیہ کے بازاروں میں ولایتی کپڑے سے ارزاں بکتے تھے۔ ہندوستانی مال کی قیمت ولایتی مال سے پچاس سے لیکر ساٹھ فی صدی تک کم ہوتی تھی مگر اس پر بھی ہندوستانی کپڑے کی تجارت میں فائدہ رہتا تھا۔ چنانچہ ضرورت ہوئی کہ انگریزی صنعت کو برباد ہونے سے بچایا جائے اور ہندوستانی کپڑے کی قیمت پر جب کہ وہ انگلستان میں داخل ہو ستر اور اسی فی صدی محصول لگا دیا جائے یا اُس کی درآمد قطعی بند کر دی جائے۔ یہ ہمت شکن محصول نہ لگتے اور سخت قانون نہ بنتے تو پیزلی اور مانچسٹر کے پتلی گھر شروع میں ہی بند ہو جاتے اور پھر دُخانی انجنوں کی قوت سے بھی نہ چل سکتے۔ مگر ہندوستانی صنعت کو بھینٹ چڑھا کر انہیں زندہ رکھا گیا۔ اگر ہندوستان آزاد ہوتا تو اُس کا جواب دیتا اور برطانوی مال پر ایسے محصول لگاتا کہ پھر وہ مال ہندوستان نہ آسکتا اور اس طرح اُس کی منفعت بخش صنعت تباہی سے بچ جاتی۔ لیکن اُس کو اپنے تحفظ کی اجازت نہ دی گئی۔ وہ اغیار کے سامنے بے بس تھا۔ بغیر کسی محصول کے برطانوی مال اُس کی بندرگاہوں پر زبردستی اُتار دیا گیا اور آخرکار جس حریف سے برابر کا مقابلہ کرنے کی مجال نہ تھی اُس کو برطانوی کارخانہ داروں نے

ایک نامنصف حکومت کے ہاتھ سے حلال کرا دیا۔

(دت۔ صفحہ ۲۶۲-۲۶۳)

غرض کہ انگلستان کی صنعت کو فروغ دینے اور ہندوستان کی صنعت کو توڑنے کے لیے جس قدر ہتھیار ممکن تھے وہ سب کے سب انگلستان نے استعمال کیے تب کہیں جاکر ہندوستان صنعتی ملک سے زرعی ملک بنا اور انگلستان زرعی ملک سے صنعتی ملک بنایا گیا۔

۱۴۔ انگلستان اور ہندوستان کی صنعت و زراعت کا مقابلہ ذیل کے نقشہ سے اس امر کا اندازہ ہوگا کہ موجودہ زمانہ میں صنعت و زراعت کے اعتبار سے انگلستان اور ہندوستان کی نسبتی حالت کیا ہے

نام پیشہ	انگلستان		ہندوستان
صنعت اور کان کنی	٧ر٧٥ فی صدی	۱۱ فیصدی	۱۱ فیصدی
تجارت	٣ر٣١		
زراعت	١١ر٥ فی صدی		۷۱ فیصدی

اس نقشہ سے ظاہر ہے کہ انگلستان جو کسی زمانہ میں ایک زرعی ملک تھا اب وہاں صرف (۱۱½) ساڑھے گیارہ فی صدی زراعت پیشہ لوگ رہ گئے ہیں جو ہندوستان کی صنعتی آبادی کے مساوی ہے اور اسی انگلستان کی صنعت و تجارت کو اس قدر ترقی ہوئی ہے کہ وہاں کی صنعت و تجارت

پیشہ آبادی اکہتر فی صدی تک پہونچ گئی جو ہندوستان کی موجودہ زرعی آبادی کے مساوی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہندوستان کی صنعت و حرفت باوجود نام نہاد محکمہ صنعت و حرفت پر کروروں روپیہ خرچ کئے جانے کے روز بروز زوال پذیر ہو رہی ہے۔ پنجاب کے ماہوار رسالے "کواپریشن" نے اپنی اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء کی اشاعت میں مسٹر کیلورٹ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سنہ ۱۸۹۱ء اور سنہ ۱۹۰۱ء کے درمیان زراعت پیشہ اشخاص کی تعداد بڑھی اور صنعت و حرفت پیشہ لوگوں کی کم ہوئی۔ رسالہ مذکور نے اسی بارہ میں سنہ ۱۹۰۱ء اور سنہ ۱۹۲۱ء کے مندرجہ ذیل صوبہ وار اعداد دے کر دونوں سالوں کی تعداد کا مقابلہ کیا ہے۔

نام صوبہ	زراعت پیشہ		صنعت و حرفت پیشہ	
	سنہ ۱۹۰۱ء	سنہ ۱۹۲۱ء	سنہ ۱۹۰۱ء	سنہ ۱۹۲۱ء
بنگال	۷۱٫۵	۷۷٫۵	۱۳٫۳	۷٫۸
بمبئی	۵۸٫۶	۶۱٫۲	۱۸٫۲	۱۲٫۳
برہما	۶۶٫۱	۷۰٫۷	۱۸٫۶	۶٫۹
صوبہ متوسط	۷۰٫۰	۷۴٫۲	۱۶٫۲	۹٫۸
مدراس	۶۹٫۰	۷۰٫۸	۱۷٫۵	۱۱٫۶
صوبہ متحدہ	۶۵٫۵	۷۵٫۰	۱۴٫۹	۱۱٫۰
پنجاب	۵۶٫۹	۵۹٫۰	۱۹٫۴	۱۹٫۳
میزان	۶۵٫۲	۷۰٫۸	۱۵٫۵	۱۰٫۶

مندرجۂ بالا نقشہ سے پوری طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ہر صوبہ میں صنعت پیشہ لوگوں کی تعداد برابر گھٹ رہی ہے اور اُسی نسبت سے زراعت پیشہ لوگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جس کا انجام نہ معلوم کیا ہونے والا ہے۔ غرض کہ صنعت و حرفت کے بارہ میں انگلستان تحت الثریٰ سے آسمان پر جا پہونچا اور ہندوستان رفتہ رفتہ آسمان سے اُتر کر تحت الثریٰ میں جا رہا ہے۔ جو لوگ شہد کے چھتے سے شہد حاصل کرتے ہیں وہ محض شہد نچوڑنے پر اکتفا کرتے ہیں اور مکھیوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ چھتا درست کر کے پھر شہد جمع کریں۔ مگر انگریزی حکام نے اس اصول کو بھی مدنظر نہ رکھا۔ ہندوستان کے صناعوں کو اُن کے برتاؤ سے اس قدر صدمہ پہونچا کہ وہ ہمیشہ کے لیئے اپنے پیشوں سے محروم ہو گئے۔ اور ان کے پیشے کا کوئی امکان باقی نہ رہا۔ اس دردناک داستان کی مثال تاریخ کے صفحات میں ملنا ناممکن ہے۔

مگر اسے کاش ہندوستان کی زراعت یا صنعت جس حالت پر پہونچ گئی ہے وہ اس قابل رہتی کہ اُس سے یہاں کے باشندوں کی بسر اوقات ہو سکتی۔ امریکہ میں اسی زراعت سے وہاں کے لوگ لکھ پتی اور کروڑ پتی بنے ہوئے ہیں۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں آبادی کا کثیر حصہ فاقہ کشی میں مبتلا ہے۔ اور روز بروز مفلس ہوتا چلا جاتا ہے۔ سر ابراہیم رحمت اللہ صاحب نے گزشتہ صنعتی اور تجارتی کانگریس منعقدہ مدراس میں اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ :۔

"جنگ سے پہلے کپڑے کا اوسط صرف، جو ضروریات زندگی میں داخل ہے بہ لحاظ آبادی ۸اگز فی کس تھا اور اب ۱۰ اگز فی کس رہ گیا ہے۔"

انگلستان کی ایک بڑی غرض ہندوستان پر قبضہ رکھنے سے یہ بھی ہے کہ یہاں انگلستان کے تیار کردہ مال کی نکاسی ہوتی رہے۔ مگر جب ہندوستان کی قوت خرید گھٹتی ہے تو اس کا اثر انگلستان کے کاریگروں پر پڑتا ہے جس سے وہ بیکار ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے گورنمنٹ ایسے طریقے اختیار کرتی ہے جن سے ہندوستان کے لوگ پھر انگلستان کا مال خریدنے لگتے ہیں۔ اس کے متعلق سر ابراہیم نے حسب ذیل تحریر فرمایا ہے:۔

"انگلستان میں بیکاری کو دور کرنے کی کوشش ممکن ہے عارضی طور پر کامیاب ہو جائے۔ لیکن یہ مشتبہ ہے کہ اس کارروائی کا اثر ہندوستان ہی نہیں بلکہ خود انگلستان کی آئندہ بہبودی پر مفید ہوگا یا غیر مفید۔ جب یہ حال ہو کہ قیمتوں کی ارزانی نمایشی ہو اور اُن سے قوم کی اقتصادی بنیادوں میں تنزل ہو رہی ہو تو زیادہ عرصہ تک خریداروں کا میسر آنا ناممکن ہے۔"

ذیل کے اعداد سے سر ابراہیم نے مختلف ممالک کی فی کس آمدنی کا فرق دکھایا ہے۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ	دو ہزار روپیہ سالانہ
برطانیہ عظمٰی	ایک ہزار روپیہ سالانہ
کناڈا اور آسٹریلیا	پانسو پچاس روپیہ سالانہ

ہندوستان چند سال پیشتر   تیس روپیہ سالانہ

اس تخمینے کی غلطیوں کا اور اس کے بعد جو اقتصادی ترقی ہوئی ہو اُس کا لحاظ رکھکر اب ہندوستان کی فی کس سالانہ آمدنی اندازاً ساٹھ روپیہ سے لیکر نوے روپیہ تک بتائی جاتی ہے۔ جاپان کے متعلق سر ابراہیم لکھتے ہیں:-

"جاپان کو ہندوستان کی سی قدرتی آسانیاں حاصل نہیں ہیں بلکہ ہندوستان میں تجارت کی ترقی کے امکانات کہیں زیادہ ہیں مگر یہ ترقی اُس وقت ہو سکتی ہے کہ حکومت ہند جاپان کی سی پالیسی اختیار کرے۔"

لیکن باوجود اس کے کہ ہندوستان کو قدرت نے بہت سی آسانیاں بخشی ہیں سر ابراہیم نے جاپان کے جو اعداد و شمار دیئے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ چالیس سال کے اندر جاپانیوں میں محصول برداشت کرنے کی طاقت ہندوستانیوں سے سات گنی زیادہ ہوگئی ہے۔ گزشتہ دس برس میں جاپان کی درآمد کی رفتار ہندوستان سے چارگونی رہی اور برآمد کی رفتار ہندوستان سے تین گونی رہی اور ہندوستان اور جاپان دونوں ملکوں کی درآمد کی مقدار تھوڑے عرصہ میں مساوی ہوگئی حالانکہ ہندوستان کی آبادی جاپان سے ۵ گونی ہے۔ یہاں تک عاعت پیشہ لوگوں کی تعداد مسلسل بڑھتے جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں زمین پر روز بروز زیادہ بار پڑتا جاتا ہے جس سے اُس کی قوت گھٹتی جاتی ہے اور اُسے

آرام نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ فی کس رقبہ کاشت روز بروز کم ہوتا جاتا ہے جو کاشتکار کی بسر اوقات کے لیے کافی نہیں ہے۔

۲۴۔ کمیشنوں کے بے سود تقررات | صنعت و تجارت کا مضمون نہایت وسیع ہے اور اس مختصر رسالہ میں اس کی توضیح کی گنجایش نہیں۔ البتہ یہ امر واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب اہل ہند دیکھتے ہیں کہ باوجود صنعت و زراعت میں جان کھپانے کے اُنھیں قوت لا یموت بھی نہیں ملتا تو وہ گورنمنٹ کی خدمت میں عرض معروض کرتے ہیں۔ اُس کا علاج گورنمنٹ یہ کرتی ہے کہ محدود اختیارات کے ساتھ ایک کمیشن تحقیقات مقرر کر دیتی ہے۔ مثلاً پچھلے دنوں ایک زرعی کمیشن مقرر کیا گیا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ یہ کمیشن تمام اُن مسائل پر غور کرتا جن کا زرعی ترقی سے تعلق ہے مثلاً

(۱) قانون کے ذریعہ سے اس امر کا تحفظ کہ زرعی پیداوار میں بیرونی تاجر مقابلہ نہ کر سکیں۔

(۲) محصولات کی کمی بیشی

(۳) نئی اور بہتر فصلوں کو رواج دینا اُن کی خرید و فروخت اور کسانوں کی مالی امداد۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے اول الذکر دو اہم مسائل شاہی کمیشن کے حدود تحقیق سے خارج تھے اُنھیں صرف آخری مسئلہ پر غور کرنا تھا۔

اسی طرح جب ۱۹۱۶ء میں صنعت و حرفت پر کمیشن مقرر ہوا تو تحقیقات کے لیے جو امور متعین کیے گئے اُن میں یہہ سوال داخل نہ تھا کہ دیسی مصنوعات

کو غیر ملکی مقابلہ سے کیونکر محفوظ کیا جائے چنانچہ جس قرارداد کی رو سے کمیشن کا تقرر ہوا تھا اُس کے الفاظ یہ تھے۔

"کمیشن کو گورنمنٹ کی موجودہ مالی پالیسی پر کسی قسم کی بحث کا حق حاصل نہ ہوگا" اس کے بعد یہ بھی بتا یا گیا تھا کہ۔

"ایسی تجاویز کرتے وقت جن میں یہ سفارش ہو کہ ہندوستانی مصنوعات کی حفاظت کے لیئے بیرونی مال پر خاص قسم کے محصول لیئے جائیں۔ یہ اصول اور بھی زیادہ سختی کے ساتھ ملحوظ رکھا جائے گا۔ کیونکہ ایسا طرز عمل ہندوستان اور دیگر ممالک کے باہم جو مالی تعلقات ہیں ان پر براہ راست اثر ڈالے گا"

مندرجۂ بالا تحریرات سے ناظرین کو اس امر کا اندازہ ہوا ہوگا کہ ملک ہندوستان کی صنعت پر کس قسم کے ٹیکس لگائے گئے جن سے اس قدر زیادہ بربادی ہوئی۔ اب جب اُسے زندہ کرنے کی تجاویز سوچنے کے لیے ایک کمیشن بٹھایا جاتا ہے تو سب سے اول اُسی مسئلہ پر غور کرنے کی ممانعت کردی جاتی ہے جو اُس کی ہلاکت کا موجب ہوا تھا۔ یہی حال ہندوستان کی زراعت کا ہے کہ پیداوار میں سے ابواب وغیرہ شامل کرکے نصف سے زیادہ وصول کر لیا جاتا ہے اور زراعت کی ترقی کا مسئلہ جب پیش ہوتا ہے تو ایسے اہم امور کے متعلق جیسا کہ اوپر مذکور ہوئے سوچنے تک کی ممانعت کردی جاتی ہے۔

دوسری اہم ضرورت صنعت و زراعت دونوں کے متعلق یہہ ہے کہ ایسے طریقے اختیار کیے جائیں جن سے مال کی تیاری میں کم سے کم روپیہ صرف ہو اب بھی ہندوستان کی بعض مصنوعات اور پیداوار ایسی ہیں کہ دنیا کا کوئی ملک عمدگی میں اُن کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ مگر دنیا کے بازاروں میں وہ محض اس لیے کامیاب نہیں ہو سکتیں کہ ہندوستان میں ان اشیاء پر خرچہ زیادہ پڑتا ہے اور خرچہ اس وجہ سے زیادہ پڑتا ہے کہ اس ملک میں سرمایہ نادار دستہ ہے اور جو تھوڑا بہت ہے اُس پہ سود زیادہ دینا پڑتا ہے بدقسمتی سے ہندوستان میں جس قدر کمیٹیاں اور کمیشن بٹھائے جاتے ہیں اس کی سفارشات میں ایک لازمی سفارش یہ ہوتی ہے کہ بڑی تنخواہوں کے عہدہ دار بڑھا دیے جائیں مگر غریب کاریگروں یا کاشتکاروں کیلئے سرمایہ کا کوئی انتظام تجویز نہیں کیا جاتا۔ اس وقت ہندوستان میں کروڑوں روپیہ صنعت و زراعت کے افسروں کی تنخواہوں اور عمارتوں پر صرف کیا جاتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ اُن عظیم الشان اخراجات کا کونسہ حصّہ بطور امداد یا قرضہ کے غربا کو دیا جاتا ہے اور اگر کچھ دیا جاتا ہے تو اُس کی شرح سود کیا ہوتی ہے۔ مثلاً صوبۂ متحدہ کے سال رواں ۱۹۲۸ء کے بجٹ میں صیغہ صنعت و حرفت کے لیے ۱۵ لاکھ ۴۷ ہزار ۱۲۰ روپیہ رکھا گیا اس میں سے صرف پینتیس ہزار روپیہ پاس شدہ طلباء کی امداد کے لیے ہے۔ باقی ماندہ عہدہ داروں کی تنخواہوں اور عمارات اور صنعتی اسکولوں پہ صرف ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ صرف ۹۹ ہزار روپیہ قرضہ کے طور پہ

دیا جاتا ہے۔ اس حساب سے جس قدر رقم صیغہ صنعت پر صرف کی جاتی ہے اس میں سے صرف سات فی صدی صناعوں کو بطور امداد یا قرضہ کے دی جاتی ہے اور قرضہ پر ۶ یا ۶½ فی صدی سالانہ سود لیا جاتا ہے۔ جس کی ادائگی کے بعد برائے نام منافع حاصل ہو سکتا ہے۔ اور جس مشکل سے اور جن شرائط پر یہ روپیہ مہینوں اور برسوں میں جا کر ملتا ہے وہ تو ناقابل بیان ہیں۔ اب رہے وہ طلبا جو اسکولوں سے صنعتی کام سیکھ کر نکلتے ہیں۔ وہ بالعموم سرمایہ کی قلت کی وجہ سے ولایتی مال کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور انجام کار ملازمت تلاش کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کاش کل سرکاری بجٹ کا لاکھوں روپیہ کاریگروں کو بلا سود یا برائے نام سود پر دیا جاتا تو اس سے یہاں کے کاریگر دیسی پارچہ اور دیسی مال تیار کر کے اب سے کہیں زیادہ سستا تیار کر سکتے اور اس سے ملک کو کہیں زیادہ فائدہ پہونچتا۔ آخر دو صدی قبل ہندوستان میں کونسا صنعت و حرفت کا صیغہ تھا۔ البتہ ملک میں روپیہ کی فراوانی تھی جس سے یہاں کا مال سستا بن کر تمام دنیا میں پھیلتا تھا۔ جب ملک کا سرمایہ یا خونِ حیات بہہ کر نکل گیا تو خود بخود نفع آور کاموں کا خاتمہ ہوگیا۔ سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے جس طرح صنعتی اسکولوں کے طلبا بیکار پریشان پھرتے ہیں تقریباً یہی حال زرعی درسگاہوں کے ان طلبا کا ہوتا ہے جنھیں ملازمت نہیں ملتی اس لیے کہ انجمن ہائے امداد باہمی کے ذریعہ سے جو روپیہ قرض مل سکتا ہے اس کی شرح سود پندرہ فی صدی سالانہ یا سوا روپیہ سیکڑہ

ناہموار ہوتی ہے۔ اس پر ہندوستان کو مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ایسے ممالک کا جہاں سرمایہ کی فراوانی کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ ایک ادنی مثال یہ ہے کہ ہندوستان کے گنے میں شکر کا حصہ کافی ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے ہی بازار میں جرمنی، جاوا، اور ماریشس کی شکر دیسی شکر سے سستی بکتی ہے حالانکہ یہاں مزدوری بہت سستی ہے۔ بظاہر اس کا یہی سبب ہو سکتا ہے کہ وہاں سرمائے کی بہتات ہے۔ چنانچہ ماریشس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہاں کا چھوٹے سے چھوٹا کارخانہ ہندوستان کے بڑے سے بڑے کارخانہ سے بڑا ہے۔

۳۴۔ آئرلینڈ میں حکومت خود اختیاری کا بدیہی نفع — مندرجہ بالا فقرہ میں یہ تجویز کی گئی ہے کہ کاریگروں کو بلا سود یا کم سود پر روپیہ دیا جائے جو بظاہر ناممکن العمل معلوم ہوتی ہے۔ مگر حال میں مجھے ایک مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ جو مسٹر برج نندن لال نے یو۔ پی کو آپریٹو جرنل کے اپریل نمبر میں لکھا ہے اس مضمون میں یو۔ پی کی کوآپریٹو انجمنوں کا آئرلینڈ کی انجمنوں سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ مسٹر برج نندن لال لکھتے ہیں:-

> "حکومت آئرلینڈ کے محکمہ زراعت نے امداد کرنے والی انجمنوں کو دس ہزار پونڈ بغیر سود کے قرض دیے ہیں۔ اُن کا اصول یہ ہے کہ کوئی سوسائٹی ایک پونڈ جمع کر لیتی ہے تو محکمۂ زراعت اوسے دو پونڈ بلا سود دے دیتا ہے۔ البتہ کوئی سوسائٹی کچھ روپیہ بھی فراہم نہ کر سکے تو محکمہ کی طرف سے

تین فی صدی سالانہ سود پہ روپیہ دیا جاتا ہے"

اس کا مقابلہ ہمارے صوبہ کی امدادی انجمنوں سے کیجیئے ۔ جہاں سنٹرل بنک انجمنوں سے بارہ فی صدی سود لیتے ہیں ۔ مسٹر بیج نندن لال پھر لکھتے ہیں کہ :-

" مکھن نکالنے کے کارخانوں سے جو لوگوں کی ذاتی ملکیت تھے اور غیر ملکیوں کے مقابلہ سے کسانوں کو نقصان پہونچا رہے تھے گورنمنٹ نے کاشتکاروں کو محفوظ رکھنے کے لیے تمام کارخانے خرید لیے ۔ چنانچہ ۳۶۵۰۰۰ پونڈ یا بہ الفاظ دیگر پچپن لاکھ روپیہ گورنمنٹ کی طرف سے صرف اُن کارخانوں کی قیمت میں ادا کیا گیا جو ایک مشترکہ کمپنی کی ملکیت تھے ۔ اس کمپنی کے زیادہ تر حصے لندن کی ایک کمپنی کے پاس تھے جس کا نام سون لیونل اینڈ کرسمس تھا ۔ اب یہ کارخانے امدادی انجمنوں کے ہاتھ فروخت کیے جا رہے ہیں ۔ اور گورنمنٹ نے کام کرنے والوں کو ۱۶۵۰۰۰ پونڈ کی رقم اور قرض دے دی ہے تاکہ امدادی انجمنوں کی طرف سے اُن علاقوں میں بھی مکھن کے کارخانے کھول دیئے جائیں جہاں اب تک موجود نہ تھے "

یہ تو دیگر ممالک کے حالات ہیں ۔ اب سوال یہ ہے کہ زرعی یا صنعتی کمیشنوں کے ممبروں نے آیا کبھی کوئی ایسی سفارش کی ہے کہ کاریگروں یا

کاشتکاروں کے ساتھ یہ رعایت کی جائے کہ اگر وہ ایک رقم خود فراہم کرلیں تو اُنھیں اُس سے دوگنی رقم بلاسودی دی جائے اور اگر وہ قطعاً کچھ فراہم نہ کرسکیں تو انھیں بحساب ۳ فی صدی سالانہ یا چار آنہ سیکڑہ ماہوار کے سود پر قرضہ دیا جائے یا خاص لندن کی کسی کمپنی کے کارخانہ کو غیر ملک کا کارخانہ قرار دیا جائے اور اس بنا پر اُسے خرید کر اہل ہند کے سپرد کرنے کی سفارش کی جائے۔ اگر اس قسم کی سفارشات ہندوستان کے کمیشنوں نے نہیں کیں یا کی ہیں اور اُن پر گورنمنٹ نے کوئی عمل نہیں کیا تو ہمیں یہ کہنے کا حق ہے کہ ایسے لایعنی کمیشنوں پر لاکھوں کروڑوں صرف کرنا روپیہ کا ضائع کرنا اور ہندوستان پر فرید اخراجات کا بار ڈال کر اُسے برباد کرنا ہے۔

ہم نے اوپر بیان کیا تھا کہ جو کمیشن ہندوستان میں مقرر کیے جاتے ہیں اُن کے دائرہ تحقیقات کو محدود کر دیا جاتا ہے مثلاً اُن مسائل پر غور کرنے کی ممانعت کردی جاتی ہے جو گورنمنٹ کی مالی پالیسی سے تعلق رکھتے ہیں یا ہندوستانی صنعت کو محفوظ رکھنے کے لیے محصولات لگانے کے متعلق ہیں۔ اس قسم کے کمیشنوں کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص کے جسم پر جونکیں چمٹ گئی ہیں جو اُس کا خون چوس رہی ہیں اور اس سے وہ کمزور ہوتا جاتا ہے۔ اُس کے علاج کے لیے اُسی کے صرف سے بڑی بڑی فیسیں دیکر اطبا رحاذق اور قابل ترین ڈاکٹر جمع کیے جاتے ہیں مگر اُن سے کہدیا جاتا ہے کہ جسم پر سے جونکیں چھڑائے بغیر مریض کا علاج کریں۔ ایسی حالت میں اگر آب حیات اور اکسیر سے بھی علاج کیا جائے تب بھی مریض جاں بر نہ ہوسکیگا

۴۴۔ صنعت و زراعت کی بحالی کا ذریعہ

اگر اس قسم کے کمیشنوں سے ہندوستان کی صنعت و زراعت کے مسائل حل نہیں ہو سکتے تو اب وہ کون سے ذرائع ہیں جن سے وہ حل کیے جا سکیں۔ اس مسئلہ پر رائے قائم کرنے میں ہمیں سر ابراہیم رحمت اللہ کے لیکچر کا ایک حصے پڑھنے سے امداد ملے گی۔ اس لیے ہم اُسے بجنسہٖ اس موقع پر نقل کرتے ہیں:۔

"یہ صحیح ہے کہ ۱۸۵۸ء میں ہندوستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی سے منتقل ہو کر تاج برطانیہ کے قبضے میں آگئی لیکن سوال یہ ہے کہ اس انتقال کے بعد یہاں کی اقتصادی حالت میں بھی کوئی فرق پیدا ہوا یا نہیں۔ وہ اختیارات جو پہلے بورڈ آف ڈائرکٹرس کو حاصل تھے۔ نام کو تو پارلیمنٹ کے سپرد ہو گئے لیکن فی الواقع تبدیلی صرف اس قدر ہوئی کہ بورڈ آف ڈائرکٹرس کی جگہ صاحب وزیر ہند اور اُن کی کونسل نے لے لی۔ حالات کی اصلیت کیا ہے؟ اُس کی ایک روشن مثال حال ہی میں پیش آچکی ہے وہ یہ کہ حکومت ہند کے وزیر مال سر باسل بلیکٹ کو بذات خود انگلستان جانا پڑا تا کہ زر و بنک کے اختلافی مسئلہ میں اپنی رائے کو "بورڈ آف ڈائرکٹرس" کے سامنے پیش کر سکیں۔ ایک تجارتی کمپنی جس کا صدر مقام لندن ہو۔ اور کوٹھیاں کسی غیر ملک میں قائم ہوں بالعموم یہی طرز عمل اختیار کرتی ہے جو اس وقت ہندوستان جیسے وسیع ملک کے ساتھ

برتا گیا۔ غیر ملکی کو ٹھیوں کا منتظم عموماً مقام پر طلب کیا جاتا ہے تاکہ وہ بورڈ اور حصہ داروں کا اطمینان اس بارہ میں کر دے کہ اُس کی مجوزہ پالیسی کمپنی کے حق میں سب سے زیادہ مفید ہے۔ اس صورت میں فرق صرف اس قدر تھا کہ حصہ داروں کی جگہ برطانوی ساہوکاروں کو اطمینان دلانا تھا۔ برطانیہ کا اصلی حاکم "ووٹ" ہے اور ووٹ کی بدولت ساہوکاروں اور کارخانہ داروں کو زبردست سیاسی اثر حاصل ہے۔ اسی ووٹ کے سہارے پر وزارتیں قائم رہتی ہیں لہذا نا ممکن ہے کہ حکومت ووٹ دینے والوں کے مطالبہ سے منہ موڑ سکے۔ مسٹر بالڈون نے ذرا کوشش کی تھی کہ آزاد تجارت کی پالیسی میں کسی قدر ترمیم کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انتخاب کے وقت کنسرویٹو جماعت کو نیچا دیکھنا پڑا۔"

اس تقریر سے یہ امر واضح ہو گیا کہ ہندوستان کی سلطنت کی باگ انگلستان کے تاجروں ووٹوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اگر کوئی امر اُن کے نفع کے خلاف ہو تو وہ ہندوستان کے ذمہ دار افسروں کو وہاں طلب کر کے اپنے احکام کی تعمیل کرا سکتے ہیں۔ اگر کوئی وزیر اعظم تجارت کی آزادی کے لئے اُن کے نفع کے خلاف کوئی تجویز کرے تو وہ اُسکو نکال سکتے ہیں۔ اِن حالات میں ہر شخص اس امر کا اندازہ کر سکتا ہے کہ ہندوستان کی صنعتی اور زرعی مشکلات کا حل نہ گورنر صاحب کر سکتے ہیں اور نہ وائسرائے ہند نہ وزیر ہند کر سکتے ہیں اور نہ وزیر اعظم انگلستان۔ البتہ اگر اہل ہند کو شہنشاہ معظم کے ۱۹۱۹ء کے اعلان کے مطابق مثل نو آبادیات کے حکومت خود اختیاری ملجائے

اور اس سے اُن کے ووٹ کو وہی قوت حاصل ہو جائے جو انگلستان یا آئرلینڈ کے تاجروں کو حاصل ہے تب ہی اُن کی صنعت و تجارت بحال ہو سکتی ہے اور وہ موجودہ ناداری، افلاس اور مصیبت کے چکر سے نکل سکتے ہیں۔ اس ذریعہ سے ہندو مسلمان، سکھ یا پارسی سب کے سب کو یکساں نفع پہونچے گا۔ نہیں بلکہ مسلمانوں کو سب سے زیادہ نفع پہونچے گا جو زیادہ تعداد میں پارچہ باف اور دوسرے کاریگر یا تاجر ہیں جن کے کاروبار اب بگڑ گئے اور جنہیں دوسری قوموں کے لوگ مذہبی تعصبات کی وجہ سے دفاتر اور ملازمتوں میں نہیں گھسنے دیتے۔ ان وجوہ سے حکومت خوداختیاری کے مطالبہ میں مسلمانوں کو دوسری قوموں کے ساتھ نہایت گرمجوشی کے ساتھ شریک ہونا ازبس ضروری ہے۔

۴۵۔ ہندوستان میں شرح سود زیادہ ہونے کی وجہ

مندرجۂ بالا صفحات میں ہم نے یہ دکھایا تھا کہ اس ملک میں عام شرح سود زیادہ ہے جس کی وجہ سے یہاں کی تجارت و صنعت دیگر ممالک کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ شرح سود کی یہ حالت ہے کہ عام کاریگروں اور کاشتکاروں کو ایک پیسہ روپیہ سے چار پیسہ روپیہ ماہوار تک دینا پڑتا ہے جس کے حساب سے ۱۸ فی صدی ہوا سے لیکر ۷۵ ماہوار تک ہوتا ہے اور سالانہ کے حساب سے اٹھارہ روپیہ بارہ آنہ سے لیکر پچھتر فی صدی تک پہونچ جاتا ہے اور بعض صورتوں میں اس سے بہت زیادہ سود دیا جاتا ہے۔ حال میں اخبارات میں صوبہ بنگال کا ایک مقدمہ شائع ہوا ہے جس میں مدیون نے ۲۲ روپیہ قرضہ لیا تھا

وہ ۱۳ سال میں بحساب سود در سود ۶ ۲ لاکھ روپیہ تک پہونچ گیا۔

اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں ہمیشہ سے یہی شرح سود رہی ہے یا اب بڑھ گئی ہے۔ اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ اس ملک میں زمانہ سابق میں دام دو پٹ کا قانون رائج تھا اور بعض صوبجات میں وہ اب تک نافذ ہو جس کی رو سے اصل رقم قرضہ سے زیادہ سود کی رقم نہ بڑھ سکتی تھی۔ ۱۸۵۵ء سے انگریزی سلطنت نے شرح سود کو آزاد کر دیا اور سود در سود کی رقم کو غیر محدود کر دیا جس کی بنا پر اب ایسے مقدمات دائر ہو سکتے ہیں جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ پنجاب کے ایک افسر مسٹر تھاربرن نے اپنی کتاب موسومہ "پنجاب کے مسلمان اور مہاجن" میں بندوبست کی رپورٹ نوشتہ کرنل ویس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

> "عام شرح سود ایک فی صدی ماہوار تھی اگرچہ مشتبہ قرضوں کیلئے دو روپیہ بھی ہوتی تھی۔ ایک فی صدی سے زیادہ سود لینا زیادہ ستانی سمجھا جاتا تھا۔ اس لیئے اچھی حیثیت کے کھتری اپنی ساکھ قائم رکھنے کے لیئے بالعموم ایک فی صدی سود لیا کرتے تھے۔" اسی رپورٹ میں کرنل موصوف نے آگے چل کر لکھا ہے کہ "قرضہ جات کے لیئے عام شرح سود اب دو یا تین فی صدی ہوگئی ہے اور مشتبہ قرضہ جات کے لیئے اس سے بھی زیادہ لیا جاتا ہے۔"

اس تحریر سے ظاہر ہے کہ زمانہ سابق میں ایک روپیہ سیکڑہ سے زیادہ

سود لینا معیوب سمجھا جاتا تھا پھر دو تین روپیہ سیکڑہ تک پہونچ گیا۔ اُس کے بعد تو کوئی حد ہی باقی نہیں رہی۔ اور اب خاص گورنمنٹ کی سرپرستی میں کوآپریٹو سوسائٹیوں کے ساتھ خاص مراعات برتی جاتی ہیں تب کہیں اُس کے ممبروں کو ۱۲ سیکڑہ پر قرضہ دیا جاتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ملک میں اس قدر زیادہ شرح سود کی کیا وجہ ہے۔ اس کا جواب صاف یہ ہے کہ یہاں روپیہ کی کمی ہے۔ اور کمی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ جب سے انگریزی عملداری آئی ہے۔ بے شمار روپیہ یہاں سے انگلستان کو کھنچا چلا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ حسب ذیل چند اقتباسات سے ہوگا۔ مسٹر بروکس ایڈمس نے اپنی کتاب "قانون تمدن و تنزل" میں لکھا ہے:۔

"یہ اندوختہ جس کو لاکھوں انسانوں نے صدیوں میں جمع کر پایا تھا انگریزوں کے ہاتھ لگا اور اس طرح لندن پہونچ گیا جیسے کبھی رومن، یونان اور پونٹس کی غنیمت اطالیہ میں لے آئے تھے اس خزانہ کی تعداد کیا تھی، کوئی نہیں کہہ سکتا مگر ظاہر ہے کہ وہ کروڑوں پونڈ کی قیمت کا ہوگا۔ اگر یہ ملحوظ رکھا جائے کہ اُس عہد میں یوروپ والوں کے پاس سونے چاندی کی مقدار کتنی تھی تو نسبتاً اتنی دولت بہت بڑی رقم ہوئی"

(ان ہیپی انڈیا صفحہ ۳۲۲)

لارڈ میکالے کا قول ہے کہ "دولت کے دریا انگلستان کو بہتے چلے جاتے تھے۔

مسٹر فلپ فرانسس جو کبھی بنگال کونسل کے ممبر تھے لکھتے ہیں:۔

"ایک انگریز کو یہ معلوم ہو کر تکلیف ہونی چاہیئے کہ جب سے کمپنی کو دیوانی ملی ہے اہل ملک کی حالت پہلے سے بدتر ہوگئی ہے اور یہ کمپنی کی تجارت وغیرہ کا نتیجہ ہے" میرے خیال میں یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے یہ ملک ایک شخصی او مطلق العنان حکومت کے زیر سایہ تو سرسبز ہوتا رہا مگر جب انگریزوں کے تصرف میں آیا تو تباہی کے کنارے پہونچ گیا

(ان ہیپی انڈیا۔ صفحہ ۳۳۴)

مسٹر مانٹیگومری مارٹن نے ۱۸۳۹ء میں لکھا تھا:۔

"اگر دولت کا ایسا مسلسل اور روز افزوں سیلان انگلستان سے ہونے لگے تو ایک دن وہ بھی محتاج ہو جائے" پھر خیال فرمائیے کہ ہندوستان پر کتنا سخت اثر ہونا چاہیئے۔ جہاں معمولی مزدور کو دو یا تین پیسے روزانہ اُجرت ملتی ہے۔

پروفیسر ایچ ایچ ولسن نے جو ہندوستان کے مورخ ہیں لکھا ہے:۔

"اس دولت کو انگلستان پہونچانا گویا ہندوستانی سرمائے کو بلا معاوضہ چھین لینا ہے۔ یہ سیلان ایک دن ملک کو کھوکھلا کر کے رہے گا کیونکہ اس کا بدل کچھ نہیں دیا جاتا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ ہندوستان کی صنعت کی رگوں سے خون چوسا جا رہا ہے مگر طاقت بحال رکھنے والی کوئی غذا نہیں دی جاتی"

ان ہیپی انڈیا صفحہ ۳۴۱

مسٹر اے جی ولسن ایک مضمون میں جو ۱۸۸۴ء کے فورٹ نائٹلی ریویو میں شائع ہوا تھا لکھتے ہیں:-

"اس بدقسمت ملک (ہندوستان) سے ہر سال پورے تین کروڑ پونڈ (پینتالیس کروڑ روپیہ) ہم مختلف طریقوں سے کھینچ لیتے ہیں وہاں کے باشندے کی اوسط کمائی پانچ پونڈ سالانہ ہے بلکہ بعض جگہ اس سے بھی کم ہے مگر زیادہ کہیں نہ ہوگی۔ اس حساب سے ۶۰ لاکھ سے زیادہ کمانے والوں کی آمدنی ہمارے خراج میں چلی آتی ہے۔ گویا متعلقین کو شامل کرنے کے بعد تین کروڑ انسانوں کی وجہ کفاف ہم لے لیتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کے کل سرمایۂ معاش کا دسواں حصہ ہر سال ہمارے پاس کھنچ آتا ہے"۔ (ان ہیپی انڈیا صفحہ ۳۴۱)

ایک مستقل مد جس کے ذریعے ۱۷۹۲ء سے انگلستان کو مسلسل روپیہ کھنچا چلا جارہا ہے وہ اس قرضہ کی ہے جو ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارت کے لیے اپنی قوم سے لیا تھا۔ اور جو برابر بڑھتا چلا جاتا ہے۔ بقول لالہ لاجپت رای صاحب کے "انگریزوں نے جو ہندوستان کو فتح کیا ہے اس میں لطف یہ ہے کہ روز اول سے آخر دم تک برطانیہ کی گرہ سے ایک کوڑی بھی خرچ نہ ہوئی۔ اور ہندیوں کے ہی مال اور ہندیوں کے ہی خون سے ملک فتح ہوگیا۔ اسی پر بس نہیں۔ ملک گیری۔ تجارت کی توسیع۔ علمی تحقیقات۔ غرض ہر قسم کے مصارف جو انگریزوں کو ایشیا بھر میں کہیں اٹھانا پڑے ہندوستان کے خزانے سے

ہی پورے ہوئے ۔ منافع ہمیشہ انگریزوں کی جیب میں جاتا تھا اور خرچہ ۔ یا خسارہ ہوتا تھا تو ہندوستان کے سر مڑھا جاتا تھا"

مسٹر آر ۔ سی ۔ دت کہتے ہیں کہ :۔

" ہندوستان کا سارا قومی قرضہ جو کمپنی کے صد سالہ عہد میں بڑھا وہ صرف اس وجہ سے کہ

۔ جو مصارف انگلستان میں ہوتے تھے اُن کا بار ہندوستان پر ڈالا جاتا تھا"

ہندوستان کے قومی قرضے کی یہ نوعیت معلوم کرنے کے بعد دیکھنا چاہیے کہ اُس بیس سال بسال کیا اضافہ ہوتا رہا ہے ۔ ذیل کے اعداد ان ہیپی انڈیا سے ماخوذ ہیں :۔

سنہ	قرضہ
سنہ ۱۷۹۲ء	۷۰ لاکھ
سنہ ۱۷۹۹ء	۱ کروڑ
سنہ ۱۸۰۵ء	۲ کروڑ دس لاکھ
سنہ ۱۸۲۹ء	۳ کروڑ
سنہ ۱۸۳۶ء	۳ کروڑ ۳۰ لاکھ
سنہ ۱۸۴۵-۴۶ء	۴ کروڑ ۳۵ لاکھ
سنہ ۱۸۵۰ء سنہ ۱۸۵۱ء	۵ کروڑ پچاس لاکھ
سنہ ۱۸۵۷ء	۶ کروڑ پچاس لاکھ
سنہ ۱۸۵۸ء	۶ کروڑ پچانوے لاکھ
سنہ ۱۸۶۰ء	۱۰ کروڑ

۱۹۱۳-۱۴ء تیس کروڑ ستّر لاکھ

ذیل کے اعداد انڈین ایئربک سے لیے گئے ہیں:-

۱۹۲۴ اڑتالیس کروڑ - اٹھاون لاکھ چالیس ہزار

۱۹۲۵ اکیاون کروڑ سترہ لاکھ اسّی ہزار

سر ولیم ڈگبی اپنی کتاب "خوش حال برطانوی ہند" میں لکھتے ہیں کہ جو رقم ہندوستان سے کھنچ کر انگلستان چلی جاتی ہے اس کی تخمینی میزان اُنیسویں صدی کے آخر تک چھ ہزار اسّی ملین پونڈ ہوتی ہے۔ اب گذشتہ ستائیس سال کی رقوم اس میں اور جمع کر دیجیے۔ "ان ہیپی انڈیا" مصنفہ لالہ لاجپت رائے۔ میں مسٹر ہنڈمن کا ایک تخمینہ منقول ہے جو سنہ ۱۹۰۵ء میں کیا گیا تھا۔ اس کے مطابق انگلستان کو جو رقوم پہنچتی ہیں اُن کا تخمینہ چالیس ملین پونڈ سالانہ کیا گیا ہے مگر مسٹر اے جے ولسن پینتیس ملین پونڈ اور سر تھیوڈر ماریسن اکیس ملین پونڈ سالانہ تصوّر کرتے ہیں۔ ان تینوں کی درمیانی رقم پینتس ملین ہوتی ہے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ اس سیلابِ سرمایہ کا مجموعہ اس وقت تک کیا ہوتا ہے؟

مسٹر ڈگبی کے تخمینے کے مطابق سنہ ۱۹۰۰ء تک ۶۰۸۰ چھ ہزار اسی ملین پونڈ

سنہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۲۷ء تک بحساب ۳۵ ملین پونڈ سالانہ ۹۴۵ نو سو پینتالیس ملین پونڈ

میزان ۷۰۲۵ ستّر ہزار پچیس ملین پونڈ

پچھلے زمانہ میں چونکہ شرح تبادلہ مختلف رہی ہے اس لیے ایک پونڈ کو اوسطاً بارہ روپیہ کی برابر سمجھ لیا جائے تو یہ میزان چوراسی ارب روپیہ ہوتی ہے۔

بمبئی کے مسٹر کے ٹی شاہ نے بھی اُس دولت کا تخمینہ کیا ہے جو ہندوستان

سے باہر چلی جاتی ہے۔ اس کا خلاصہ اُن کی کتاب موسومہ "ہندوستان کی دولت اور ادائیگی محصول کی گنجایش" کے صفحہ ۲۳۶ پر ذیل کے الفاظ میں درج ہے:

"اس طرح مجموعی طور پر ہندوستان تقریباً تیس کروڑ سالانہ کا مقروض ہو جاتا ہے۔ لیکن بظاہر یہ قرضہ وصول ہونے کے بعد ختم نہیں ہو جاتا بلکہ وہی رقم دوبارہ قرض دے دی جاتی ہے۔ لہذا ہندوستان کے وسائل آمدنی پر کفالت کا بار اور زیادہ بڑھ جاتا ہے"

۴۶۔ سیلان سرمایہ کا اثر ادنے طبقہ پر | ہندوستان کے قرضہ اور سیلان سرمایہ کے مندرجہ بالا اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ وہ کس قدر خوفناک ہیں۔ اِن حالات میں تعجب ہے کہ ہندوستان کے لوگ زندہ کس طرح ہیں مگر جس قسم کی زندگی وہ بسر کر رہے ہیں اُس کا اثر خود یوروپ کے بعض نیک دل لوگوں کے دلوں پر پڑتا ہے۔ سر چارلس الیٹ نے جو آسام کے چیف کمشنر رہے ہیں ۱۸۸۸ء میں تحریر فرمایا تھا کہ

"میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ کاشتکاروں کی نصف تعداد ایسی ہے جو سال بھر تک یہ نہیں جانتی کہ ایک وقت پیٹ بھر کر کھانا کیسے کہتے ہیں"

مسٹر اِرون ڈپٹی کمشنر رائے بریلی کا ایک مقولہ اُن مسلمانوں پر صادق آتا ہے جو شہری زندگی بسر کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:۔

"کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ (شہروں کے باشندے) خوراک کی قلت سے جو تکلیف اُٹھاتے ہیں وہ اُس سے کہیں زیادہ ہے

جو کسانوں کو برداشت کرنا پڑتی ہے بالخصوص پردہ نشین مسلمان عورتوں اور مفلس شرفا کو جن کا وقت بگڑ گیا ہے، جو شرم کے سبب سے بھیک نہیں مانگ سکتے اور جن کو بچی کھچی جائداد پر گزر کرنا پڑتی ہے اور جنہیں نرخ کی گرانی بری طرح ستاتی ہے"

مسٹر اے۔ اے پرسنل ممبر پارلیمینٹ نے اس سال ہندوستان کے سفر سے واپس ہو کر مزدور پیشہ لوگوں کی نسبت فرمایا تھا کہ

"یہ لوگ مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں"

لالہ لاجپت رائے نے ایک امریکن مشنری کا قول نقل کیا ہے کہ۔

"جنوبی ہندوستان کے لوگ زندگی بسر نہیں کرتے، بلکہ زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔ میں نے ایسے گھر دیکھے ہیں جہاں لوگ مردار گوشت کھا کھا کر رہتے تھے۔ اور اس زمانہ میں کوئی عام قحط بھی نہیں بتایا جاتا تھا"

اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مقامات کے لوگ مردار تک کھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں مگر ابھی افلاس کی ایک اور منزل باقی ہے اور وہ یہ کہ بھوک سے تنگ آ کر ایک انسان دوسرے انسان کو کھانے لگے۔ اس قسم کے اندیشہ کا اظہار مسٹر ڈبلیو۔ ایس۔ بلنٹ نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔

"میں ہندوستانی مالیہ کے اسرار بہترین اُستادوں سے حاصل کر رہا ہوں۔ اور یہ معلم گورنمنٹ کے سکریٹری اور کمشنر وغیرہ ہیں۔ اس مطالعے سے میں جس نتیجے پر پہونچا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر ہم اسی

طرح ملک کو ترقی دیتے رہے تو ایک دن وہ آئے گا کہ ہندوستانی
مجبور ہو کر ایک دوسرے کو کھانے لگیں گے کیونکہ اپنے ہم جنسوں
کے سوا دوسری چیز نہیں مل سکے گی "

مسٹر بلنٹ کو اندیشہ ہے کہ انسان ایک دوسرے کو کھانے لگیں گے مگر ہندوستان کے خشک سالیوں کے واقعات موجود ہیں جب کہ بھوک کی شدت سے عورتوں نے اپنے بچوں کو بھون کر کھا لیا ہے۔ انگلستان کے عوام الناس اس امر کو نہیں سمجھتے کہ ہندوستان کے افلاس کا خود انگلستان پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔ اگرچہ وہاں کے دوربیں لوگ برابر اس امر کو جتاتے رہتے ہیں۔ آج کل انگلستان میں بیکاری کا مسئلہ بہت زوروں پر ہے۔ انگلستان میں دو لاکھ کان کن بیکار تھے۔ گورنمنٹ نے ان کی طرف سے جو بے اعتنائی برتی اس پر اظہار نفرت کرنے کے لیے ۲۴ر جولائی ۱۹۲۸ء کو مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے گورنمنٹ پر ملامت کی تحریک پیش کی۔ مباحثے کے دوران میں مسٹر اسنوڈین نے کہا کہ :۔

" ہندوستانی کاشتکاروں کو اگر اتنا دولت مند کر دیا جائے
کہ اُن کی ہفتہ وار خریداری کا اوسط تین فارذنگ (تین پیسے)
کے بقدر بڑھ جائے تو لنکا شائر میں سوت کاتنے اور کپڑا بننے
کی ایک کل بھی بیکار نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح اگر ہماری یہ خواہش ہو
کہ لوہے اور فولاد کی تجارت پھر اُبھر جائے اور ہندوستان
میں اس کی مانگ کے جو وسیع امکانات ہیں وہ وجود میں آ
جائیں تو ہمیں چاہیئے کہ ایک طرف تو زمین جوتنے کے لیے

آلاتِ کشاورزی بھیجیں اور دوسری طرف ہندوستانی کسان کو
کھاد وغیرہ کی ضروریات کے لیے روپیہ بہم پہونچایئں۔ اگر
ایسا کیا جائے تو برطانیہ میں مشینوں کی تجارت کو وہ عروج ہو
کہ آج تک دیکھنے میں نہ آیا ہے"۔
اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب انگلستان کی گاڑی بھی بغیر ہندوستان
کا افلاس دور کئے ہوئے نہیں چل سکتی

۴۷۔ تعلیمی ترقی کی رفتار اہلِ ہند کی مالی حالت کے بعد اب ہم اُن کی تعلیمی حالت
پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں زمانہ سابق میں تعلیم صرف درباریوں، اعلیٰ عہدہ داروں
اور دفتر کے لوگوں کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھی اب وہ ہر شعبۂ زندگی کا جزو لازمی
بن گئی ہے۔ اس اعتبار سے تعلیم اب دو قسم کی قرار دی گئی ہے۔ ایک اعلیٰ تعلیم
دوسرے ابتدائی تعلیم۔ اعلیٰ تعلیم کی غرض اعلیٰ عہدے ملنے کے علاوہ یہ ہوتی
ہے کہ اُسے حاصل کرکے انسان صنعت وحرفت تجارت اور زراعت۔ اور
اسی قسم کے تمام پیشوں میں کمال حاصل کرسکے۔ گزشتہ صفحات میں ہم نے
مختصر طور پر دکھا دیا ہے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہندوستانی، بجز
اُن چند خوش نصیب افراد کے جنہیں اعلیٰ عہدے ملنے میں کامیابی ہوجائے
کس قدر پریشانیوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور ملک میں سرمایہ کی کمی کی وجہ سے
اُنھیں معاش کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ اب رہے معمولی لکھے پڑھے لوگ
جن کی تعداد میں اضافہ ہونا ملک کی صنعت و زراعت اور تمام دوسرے
پیشوں کی ترقی کے لیے اور سیاسی حقوق وسیع پیمانہ پر ملنے کے لیے ضروری

سمجھا جاتا ہے۔ اُس کی رفتار اس ملک میں انتہا درجہ سست ہے اس وقت دُنیا کے دوسرے ممالک خواندوں کی تعداد بڑھانے میں نہایت سرعت سے کام لے رہے ہیں اور ترقی یافتہ ممالک کی نسبت سُنا جاتا ہے کہ وہاں پچانوے فی صدی تک خواندوں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ آج کل ہر ملک جو ترقی کی طرف قدم بڑھاتا ہے اُس کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ جلد سے جلد ابتدائی تعلیم کی توسیع کرے۔ مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہمارے ملک نے اس بارہ میں بجائے ترقی کے تنزل کیا ہے۔ لالہ لاجپت رائے صاحب نے اپنی کتاب آن ہیپی انڈیا میں انگریزی سررشتہ تعلیم کے افسروں کے حوالہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ زمانہ سابق میں ہندوستان میں خواندوں کی تعداد موجودہ زمانہ سے زیادہ تھی خیر وہ دعویٰ صحیح ہو یا غلط، ہم صرف ہندوستان کی موجودہ تعلیمی حالت اور موجودہ تعلیمی رفتار پر نظر ڈالنے پر اکتفا کرتے ہیں ۱۹۳۱ء کی گزشتہ مردم شماری کی رو سے ہندوستان میں کل ۳ء۷ فی صدی خواندہ ہیں اور جدید حساب کی رو سے پانچ برس تک کے بچوں کی تعداد خارج کر دی جائے تو آٹھ فیصدی سے قدرے زائد ہیں۔ اب پچھلی حالت پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ۱۸۸۱ء میں ہندوستان میں خواندوں کی تعداد ۳ء۲ تھی جو ۱۹۳۱ء تک پچاس سال میں ۳ء۷ فی صدی تک پہونچی گویا ۱۲½ سال میں ایک فی صدی کی رفتار سے بڑھی۔ اگر ترقی یافتہ ممالک کے خواندوں کی تعداد نوے فی صدی سمجھی جائے تو موجودہ رفتار سے ہندوستان اُس معیار تک ایک ہزار سال میں پہونچے گا۔ ناظرین کو معلوم ہوگا کہ مدت دراز سے

ہندوستان میں جبریہ تعلیم کا مسئلہ چل رہا ہے مگر سب سے بڑی رکاوٹ اس کے راستہ میں یہ ہے کہ اس کام کے لیے کافی روپیہ نہیں ملتا۔ درآں حالیکہ ساٹھ کروڑ سالانہ کے قریب فوج پر اور اسی طرح بڑی بڑی رقوم پولیس وغیرہ پر صرف کر دی جاتی ہیں۔ جن کی غرض صرف اس قدر ہوتی ہے کہ حکومت کی سطوت اور جبروت قائم رہے اور اس سے رعایا کا ایک ایک فرد حکام کے چنگل میں پھنسا رہے۔ برخلاف اس کے انگلستان میں جنگ عظیم کے دوران میں اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ثانوی تعلیم کو جبریہ کر دیا جائے وہ وقت ایسا سخت تھا کہ سلطنت کو فوجی اخراجات کے لیئے لاکھوں روپیہ روزانہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ مگر عین جنگ کے زمانہ میں ۱۹۱۸ء میں ایک قانون پاس کیا گیا۔ جس کی رو سے انگلستان کے ہر بچہ کے لیے ہائی اسکول تک کی تعلیم جبریہ اور مفت کر دی گئی اور جس طرح بن پڑا اس کام کے لیے روپیہ فراہم کیا گیا۔

کاش ہندوستانیوں کو اپنے ملک کے روپیہ پر اختیار حاصل ہو تو وہ بھی اپنے لیے جس کام کو مفید سمجھیں اُسے جاری کر سکیں۔ مگر یہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اہل ہند کے اختیارات میں توسیع نہ ہو اور وہ اپنے ملک کے محصولات کو اپنے نفع کے کاموں میں صرف نہ کر سکیں۔

۸۴۔ تعلیم عامہ کی کمی سیاسی حقوق ملنے میں مانع نہیں ہے

مگر دقت یہ ہے کہ ہندوستانی اپنے اختیارات میں توسیع چاہتے ہیں تو اُن سے کہا جاتا ہے کہ تم میں ناخواندوں کی تعداد زیادہ ہے۔ جب کافی تعداد ہو جائے گی۔ اور

سیاسی امور سمجھنے کی قابلیت تم میں پیدا ہو جائے گی تب تمہیں پوری اختیارات دیئے جائیں گے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہمیں تعلیم یافتہ بنانا اور ہم میں خواندوں کی تعداد بڑھانا بھی صدیوں سے آپ ہی کے اختیار میں رہا ہے اور اب جب کہ صیغۂ تعلیم ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں دے دیا گیا تب بھی ان صیغوں کو روپیہ دینا تو آپ ہی کے اختیار میں ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی صحیح نہیں کہ اپنے گھر کا برا بھلا انتظام بغیر تعلیم کے نہیں ہو سکتا۔ خود ہندوستانیوں کی نسبت انگریز مصنفین نے تسلیم کیا ہے کہ یہاں دیہات کا نظام مثل پنچایتی ریاستوں کے تھا۔ جس کو توڑ کر ملک پر اتنا بڑا ظلم کیا گیا کہ اس کی نظیر دنیا میں نہ مل سکے گی۔ اس کے علاوہ انسان تو بڑی چیز ہے۔ حیوانات جو جنگلوں میں رہتے ہیں حتیٰ کہ چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں میں بھی خدا نے ایسی قابلیت رکھی ہے کہ وہ اپنا ایک سردار مقرر کر کے اور اپنا ایک نظامِ ش بنا کر اس پر چلتی ہیں۔ چنانچہ حشرات الارض کی حرکات و سکنات اور ربودباش کے طریقوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہر کام میں باقاعدگی ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ اگر ہندوستانیوں کو اپنے گھر کا انتظام کرنے کے اختیارات آزادی کے ساتھ دے دیے جائیں تو وہ اسے درست رکھنے میں کامیاب نہ ہوں۔ اس مسئلہ کے متعلق کہ سیاسی قوت حاصل ہونے کے قبل جہالت کا دور ہونا ضروری ہے مسٹر کرسٹی کی رائے قابلِ ملاحظہ ہے جو انھوں نے اپنے خطوط بنام اہلِ ہند میں ظاہر کی ہے وہ یہ ہے:-

"نہ میں اس خیال کا مؤید ہوں کہ ایک رائے دہندہ محض ناخواندہ"

ہونے کی وجہ سے خارج کیئے جانے کے قابل ہے۔ حالانکہ دوسرے اعتبارات سے وہ رائے دینے کی اہلیت رکھتا ہے۔ ہیں انگلستان ہیں ہوتا تو میرے نزدیک اپنے گاؤں کے اُس دہقان کا فیصلہ جو نام لکھنا بھی نہیں جانتا ایک نووارد مدرس کی رائے سے جو اُسی روز لندن پہونچا ہے۔ زیادہ اعتماد کے قابل ہوتا (صفحہ ۱۱۰ خطوط)

آگے چل کر مسٹر کرسٹی نے لکھا ہے:-

"مختصر یہ ہے کہ تعلیمی ترقی کو ہندوستان کی سیاسی مشکل کا حل تصور کرنا جیسا کہ عرصہ سے لوگوں کا خیال ہے، ایک خطرناک مغالطہ ہے جس ہیں صداقت صرف جزاً شامل ہے ہندوستانی عقدوں کے قفل کی جو اصل کنجی ہے۔ تعلیمی ترقی اُس کا صرف ایک ٹکڑا ہے اور اکیلے اس ٹکڑے سے کام لیا جائیگا تو نتیجہ وہی ہوگا جو قفل پر ٹوٹی ہوئی کنجی آزمانے کا ہوتا ہے۔"

نیز ہز ایکسی لنسی سر مالکم ہیلی نے جب وہ اسمبلی میں تھے اس بارہ ہیں فرمایا تھا کہ

"میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ملک سیاسی ترقی سے اُس وقت تک روکا جائے جب تک کہ تعلیم یافتہ خواندوں کی تعداد غالب نہ ہوجائے اس کا انتظار تو ہم نے انگلستان میں بھی نہیں کیا۔"

۴۹۔ اہلِ ہند کا اخلاقی تنزل | مگر سب سے زیادہ جس بات کا رونا ہے وہ

ہندوستان کی اخلاقی حالت ہے۔ ہندوستان کی بڑی خوبی ہمیشہ اُس کی روحانی اور اخلاقی برتری میں رہی ہے جس زمانہ میں وہ دولت میں معراج کمال پر پہونچا ہوا تھا تب بھی مذہبیت اور روحانیت اور انسانوں اور حیوانوں کے ساتھ ہمدردی ایثار اور سادگی میں درجہ اول پر سمجھا جاتا تھا مگر آج وہ دن ہے کہ امریکہ سے ایک ناکتخدا عورت آکر اہل ہند کے کیرکٹر اور اُن کے اخلاق پر حملہ کرکے یہ کہتی ہے کہ وہ حکومت خود اختیاری کے قابل نہیں ہیں۔ مس میو کے اس الزام کی تردید میں متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں مگر ہم اس بارہ میں صرف اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ جس قسم کی حکومت کے تحت میں ہندوستان دوسو سال سے ہے اگر خود انگلستان اس قسم کی حکومت کے تحت میں ایک دو نسل بھی رہتا تو اسکا کیا حال ہوتا ۱۸۲۴ء میں جس کو ایک صدی گزری سرٹامس منرو نے کہا تھا:۔

"اگر برطانیہ پر کوئی غیر قوم قابض ہو جائے اور اہل برطانیہ کو حکومت میں دخل نہ ہو تو دینی اور دُنیوی علوم کے اس ذخیرے کے باوجود ممکن ہے کہ وہ ایک پشت کے بعد یہ قوم دنی الطبع دغاباز اور بے ایمان نہ بن جائے"

(ص ۲۷۷۔ برطانوی حکومت اور افلاس مصنفہ دادا بھائی)

عرصہ ہوا کہ ہندوستان کی نسبت سرٹامس منرو نے پیشین گوئی کی تھی کہ

"برطانوی شمشیر سے ہندوستان کے فتح ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ساری قوم ترقی کرنے کی بجائے ذلیل اور دنی ہو جائے گی" (سوانح سرٹامس منرو ص ۴۶۶)

لیکن آفریں ہے ہندوستان کو کہ برطانوی حکومت میں پچھتر سال تک رہنے کے بعد بھی اُس نے اپنے خصائل حمیدہ برقرار رکھے چنانچہ ۱۸۵۲ء میں سر ایڈورڈ ڈرائن کو ہندوستانیوں کی قابلیت اور فیصلہ مقدمات کی صلاحیت دیکھکر بڑی حیرت ہوئی اور سر آرسکن پیری نے ایک سب کمیٹی کے روبرو بیان دیتے ہوئے کہا :-

"تجارتی بہی کھاتوں کی وہ حُرمت تھی کہ کسی متنازعہ لین دین کے بارہ میں اُن کا پیش ہو جانا عدالت کے نزدیک ناقابلِ تردید شہادت سمجھا جاتا تھا۔ (ص ۴۸ ۱۹ دادابھائی)

اور سب سے زیادہ حیرت خیز یہ ہے کہ ڈاکو اور مجرم تک جان دے دینا قبول کر لیتے تھے مگر جھوٹ بولنے سے محترز رہتے تھے۔ کرنل سلیمن جس نے ٹھگوں کی سرکوبی میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے کہتا ہے کہ :-

"میرے تجربہ میں صدہا مثالیں ایسی آچکی ہیں کہ ایک آدمی کی دولت، آزادی اور زندگی جھوٹ سے بچ سکتی تھی مگر وہ جھوٹ ہی نہ بولا" (ایک ہندوستانی افسر کے تجربے اور سیاحت" دادابھائی)

اب بھی جو مقدمات انگریزی عدالتوں سے دور ہیں وہاں تقریباً یہی حالت ہے جو لوگ پہاڑوں پر جاتے ہیں وہ روزانہ دیکھتے ہیں کہ پہاڑیوں میں جھوٹ بولنے دھوکہ دینے اور چوری کرنے کی قابلیت اب تک پیدا نہیں ہوئی۔ جو مال اُن کے سپرد کر دیا جاتا ہے اُسے وہ

راستہ ہیں ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ اور اگر صحیح مقام کا پتہ نہیں چلتا تو اوسے پولیس کی سپردگی ہیں دے دیتے ہیں۔ جن کی دیانت داری خود مشتبہ ہوتی ہے۔ یہ عادات اُن کی اس وجہ سے قائم ہیں کہ اُن کا اصلی وطن پہاڑوں ہیں موجودہ تمدن سے دور ہے اور ہر سال گرمیوں ہیں وہ جدید آبادیوں سے کمائی کر کے جاڑوں ہیں اپنے سادہ گھروں کو چلے جاتے ہیں۔

یہ تمام خوبیاں اہل ہند ہیں صرف اس وجہ سے تھیں کہ دیہات کے اندرونی انتظامات ہیں سلطنت کو اس سے زیادہ دخل نہ تھا کہ وہ پیداوار ہیں سے اپنا حصّہ وصول کر لے۔ جیسا کہ ایک موقعہ پر عرض کیا گیا دیہات کے تمام اندرونی معاملات پنچایتوں کے ذریعہ سے طے کئے جاتے تھے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی بدچلن یا بدمعاش گانوں ہیں رہ سکتا۔ کیونکہ گاؤں کی پنچایت کو اختیار تھا کہ وہ بدمعاش بدچلن اور چور کو سزا دے سکے۔ برخلاف اس کے اب بجائے مواضعات کے صدر مقامات ہیں جو گاؤں سے پچیس ۲۵ تیس میل کے فاصلہ تک ہوتے ہیں جا کر انصاف ہوتا ہے اور انصاف ہونے کا انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ سائل کے پاس کافی روپیہ اور اثر ہو۔ جو شخص جائز اور ناجائز طریقوں سے روپیہ کما کر عدالتوں ہیں اور حکام کے ہاں حاضری دیتا رہتا ہے وہ تمام گاؤں پر غالب ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ اوسط درجہ کے لوگوں کی آمدنی اس قدر گھٹ رہی ہے کہ وہ عدالتی کارروائی کے اخراجات نہیں اُٹھا سکتے۔ اِس صدی کے بعض اضلاع کے کلکٹروں کی رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کاشتکاروں کی حالت کس درجہ خراب ہوگئی۔ مثلاً صاحب کلکٹر ضلع اٹاوہ نے

لکھا تھا کہ :-

"ایک مرد اُس کی عورت اور دو بچوں کی مجموعی کمائی تین روپیہ ماہوار سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ (دت جلد دوم صفحہ ۹۱)

اس حساب سے فی کس بارہ آنہ ماہوار یا ڈیڑھ پیسہ روزانہ پڑتا ہے جو بیکس انسانوں کے قوت لایموت کے لیئے بھی کافی نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ اس زمانہ کے مقدمات کے ناقابلِ برداشت اخراجات کا بار اُٹھایا جائے برخلاف اس کے جس زمانہ میں ہندوستان میں لازوال دولت تھی اُس زمانہ میں مقدمہ بازی کے اخراجات ندارد تھے۔ اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حکومت خود اختیاری کی ایک قسط حال میں ہندوستانیوں کو ملی ہے جس کی روسے وہ کونسلوں میں اہم مسائل پر رائے زنی کر سکتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ دیہات میں اب تک حکومت خود اختیاری کا تخم بھی نہیں بویا گیا۔ مثلاً گورنمنٹ ہند کے ایکٹ کی دفعہ ۱۸ کی روسے صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ نے جو قانون پنچایت نمبر ۶ سنہ ۱۹۲۰ء بنایا اور اپنے نزدیک قدیم ہندوستان کے نمونہ پر پنچایتیں قائم کیں اُن میں پنچوں کے اختیارات تو صرف پچیس روپیہ تک کے معاملات طے کرنے پر محدود کر دیئے ہیں مگر اسی کے ساتھ کلکٹر کے ہاتھ میں جملہ اختیارات دے کر اس قدر جکڑ بند کی ہے کہ اُسے پنچایت قرار دینا ہی بے معنی ہے۔ مثلاً پنچوں کا تقرر۔ سرپنچ کا تقرر۔ اُن کی علیحدگی سب کے سب کلکٹر کے ہاتھ میں ہیں۔ اب کلکٹر صاحب گاؤں سے فاصلہ پر رہتے ہیں۔ لوگوں کے ذاتی چلن سے واقف نہیں۔

گاؤں کا بدترین شخص حکام رسی کر کے اپنا اثر قائم کرتا ہے اور کلکٹر صاحب بہادر کا پروانہ تقرر حاصل کر کے لوگوں کے حقوق پر دست درازی کرتا ہے اور اس وقت سے ایک سو سال قبل لارڈ میکالے نے جو نقشہ عدالتوں اور حکام کے گرد و پیش کا کھینچا تھا اور جو اس کتاب کے شروع حصہ میں نقل کیا گیا ہے وہ اس زمانہ میں بھی بدرجہ اولیٰ صادق آ رہا ہے۔

کاش جو حالت لارڈ میکالے نے بیان کی تھی وہ صرف حکام اور عدالتوں تک محدود رہتی مگر اب تو رونے کا مقام یہ ہے کہ یہ عدالتیں تمام ملک کے لیئے مرکز اور نمونہ بن گئی ہیں۔ مثلاً ہر روز ملک کے بہترین دل و دماغ رکھنے والے لوگ کسی نہ کسی حیثیت سے انھیں عدالتوں کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ جو ممالک اس وقت برسرعروج ہیں وہاں کے لوگوں کے دماغ صنعت و حرفت، تجارت اور زراعت اور دولت کے ذریعہ سے دولت پیدا کرنے کے طریقوں میں مصروف رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے ہندوستان کے لوگ جب صبح کو اوٹھتے ہیں تو اُن میں سے کچھ لوگ تو حاکم اور عمال، بیرسٹر اور وکیل، مدعی اور مدعا علیہ، عرضی نویس اور محرر، گواہ اور دلال کی شکل میں کچہریوں کا رُخ کرتے ہیں۔ اور جو لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں وہ تمام دن مقدمات کے نتیجوں کے انتظار میں رہتے ہیں اور رات کو بیٹھکوں اور چوپالوں میں بٹھکر بقایا لگان اور اضافہ لگان، بٹوارہ اور داخل خارج کے چرچوں میں مصروف رہتے ہیں اور ان معاملات میں کامیابی حاصل کرنے کے لیئے سازشیں کرنے

اور جھوٹی شہادتیں مرتب کرنے میں مصروف رہ کر بدترین بداخلاقیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ پس جب تک کہ نظام سلطنت نہ بدلے ملک کی اخلاقی حالت کس طرح سنبھل سکتی ہے اور نظام سلطنت کی تبدیلی یہ ہے کہ ملک کو نوآبادیات جیسی حکومت جلد سے جلد عطا کی جائے۔

۵۰۔ سیاسی حقوق جملہ کمزوریوں کا علاج ہیں

مندرجہ بالا صفحات میں یہ امر واضح کیا گیا ہے کہ اہلِ ہند کے ہاتھوں میں اپنے ملک کی حکومت کی باگ نہ ہونے سے وہ ہر شعبۂ زندگی میں پست ہیں۔ ہمارے اس دعویٰ کی تصدیق مسٹر فزیراکولے ممبر پارلیمنٹ کے قول سے بخوبی ہوتی ہے جو اس سال کے شروع میں ہندوستان میں آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے مزدوروں کی پست حالت دیکھکر فرمایا تھا کہ:-

"مزدوروں کی نجات کا انحصار زیادہ تر اس امر پر ہے کہ اہل ہند کو سیاسی آزادی حاصل ہو۔"

مگر ہندوستان میں جس طریقہ پر اصلاحات کا نفاذ کیا گیا ہے۔ اور کونسلوں میں دوعملی کی حکومت جاری کی گئی ہے اُس کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ اس تجربہ میں ناکامی ہو۔ اس طریقہ میں منسٹر صاحبان ممبران کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں مگر اُن کا تقرر اور علیحدگی گورنر صاحب کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اُن کے سکریٹریوں کا تعلق براہ راست گورنر صاحب سے ہوتا ہے۔ مالیات اُن کے قبضہ سے باہر ہیں۔ غرضکہ اس قسم کے عجیب و غریب اختیارات کی نسبت جو ہندوستانیوں کو اب تک

ملے ہیں۔ مسٹر ویلیر، بنگال لیجس لیٹو کونسل کے یوروپین قائم مقام نے کیا خوب کہا ہے وہ یہ ہے کہ:۔

"ہندوستانیوں کو بجائے ذمہ داری کی تعلیم دینے کے غیر ذمہ داری کی تعلیم دی جاتی ہے"

اس قول سے ظاہر ہے کہ جس قدر اختیارات اہلِ ہند کو دیئے جائیں اُن میں وہ کامل طور پر خود مختار ہوں تب تو کچھ فائدہ ہو سکتا ہے ورنہ اُنکا وہی انجام ہوگا جو موجودہ لوکل بورڈوں اور صوبوں کے منتقل شدہ محکموں کا ہو رہا ہے۔

۵۱۔ اتحاد ضروری نہیں بلکہ متحدہ نصب العین ضروری ہے

مگر اہلِ ہند کے لیئے سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ وہ حکمراں جماعت سے حکومت خود اختیاری کس طرح حاصل کریں؟ اس کے لیئے بعض اصحاب ہندوستان کے مختلف فرقوں کے باہمی اتفاق کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اسی جذبہ کی بنا پر ہندوستان میں متعدد بار باہمی اتحاد و اتفاق کی لہر آچکی ہیں مگر کروروں انسانوں میں کوئی مستقل اور دیرپا اتحاد قائم رہنا چونکہ خلاف فطرت ہے اس لیئے اتفاق کی عارضی لہر گزر جانے کے بعد ردعمل ہوتا رہا اور پہلے سے بھی زیادہ بدتر حالت ہو گئی۔ خود یورپ کے چھوٹے سے چھوٹے ملکوں میں جو کامل خود مختار ہیں اُن میں بھی متضاد پارٹیاں موجود ہیں جو آپس میں ہمیشہ لڑتی رہتی ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ چونکہ وہاں کی پارٹیاں سیاسی بنا پر قائم ہیں اس لیے اُن کے باہمی

اختلافات سے سیاسی زندگی پیدا ہوتی ہے اور اُس سے ملک کو بجائے نقصان کے مادی نفع پہونچتا ہے۔ اور سیاسی پارٹیاں بنتی ہیں مخلوط انتخاب سے جس کی تصدیق سر فریڈرک وہائٹ کے اس قول سے ہوتی ہے کہ:۔

"جو نظام عام رائے پر مبنی ہوتا ہے اُس سے ایسی پارٹیاں بنتی ہیں جو تمدنی اور اقتصادی اختلافات پر مبنی ہوتی ہیں۔"

مگر بدقسمتی سے ہماری حکمراں جماعت نے تمام دنیا کے دستور کے خلاف ہندوستان کی مسلمان اقلیت کو جداگانہ نیابت کا حق دیا ہے جو بجائے رحمت کے اُن کے لیے زحمت ثابت ہوا ہے اور اُن کی بربادی کا موجب ہونے کے علاوہ ملک میں حکومت خوداختیاری ملنے میں مانع اور حائل ہے۔ اس لیے سب سے مقدم علاج یہ ہے کہ اقلیتوں کی نشستیں معین کرنے کے ساتھ مخلوط انتخاب جاری کیا جائے تاکہ ملک میں ہندو مسلمانوں کی پارٹیاں ٹوٹ کر سرمایہ داروں اور مزدوروں، زمینداروں اور کاشتکاروں، جدید خیال اور قدیم خیال رکھنے والوں کی پارٹیاں بن جائیں اور سب کا نصب العین بقول لائنل کرٹس کے یہ ہو:۔

"مجھے ایسا وقت آنے کی امید ہے جب کہ تمام صوبوں میں اور نیز ہندوستان کے دارالحکومت میں منتخب شدہ قانونی جماعتیں بیٹھیں گی اور انتظامی جماعتیں بھی ایسے

لیڈروں کی ہوں گی جن کی پشت پر کثرت رائے ہو گی اور
جب کثرت رائے اُن کی موافقت میں نہ رہے گی تو وہ
اُسی دم استعفےٰ داخل کر دیا کریں گے۔"

(خطوط گرسٹن بنام اہل ہند)

غرض یہ ہے کہ حکومت خود اختیاری کے لیے قطعاً اس امر کی ضرورت نہیں کہ ملک کی تمام مختلف الخیال پارٹیاں ہر اعتبار سے متحد الخیال اور شیر و شکر ہو جائیں اور اُن کے درمیان کوئی بدگمانی یا رنجش باقی نہ رہے یہ نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ البتہ ضرورت صرف یہ ہے کہ سب پارٹیوں کا نصب العین اور مطمح نظر ایک ہو اور سب پارٹیاں غلامی پر آزادی کو ترجیح دینے لگیں۔ انگلستان کی مختلف پارٹیاں آپس میں لڑتی رہتی ہیں مگر جب ملکی مفاد معرض خطر میں ہوتا ہے تو سب متحد ہو کر آڑے آجاتی ہیں چنانچہ جنگ عظیم میں سب پارٹیوں نے مل کر ایک متحد پارٹی بنائی جس کا نام کولیشن تھا اور اب سائمن کمیشن کو اپنی غریب رعایا کے مقابلہ میں کامیاب بنانے کے لیے وہاں کی جملہ متضاد پارٹیاں متحد الخیال ہو گئی ہیں۔ کاش اس سے اہل ہند کچھ سبق حاصل کریں۔

باب ہفتم

مختلف شعبہ جات زندگی میں مسلمانوں کی حالت

۵۲۔ مسلمانوں کی گزشتہ اور موجودہ حالت کا موازنہ

ملک کی سیاسیات میں مسلمانوں کا بھی ایک اہم حصّہ رہا ہے اس لیئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک جداگانہ باب میں اُن کی حالت کے متعلق تفصیل کے ساتھ عرض کیا جائے۔ مگر اسی کے ساتھ اس امر پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے کہ اس وقت سے کچھ عرصہ پہلے تک اُن کی کیا حالت تھی۔ غدر ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہوئے عرصہ ہو چکا تھا اور اُس وقت تک اُن کا کافی طور پر تنزل ہو چکا تھا تاہم اُس وقت تک بھی جو اُن کی حالت تھی اُس کا اندازہ مسٹر ہنری ہیرنگٹن طامس کی ایک تحریر سے ہوگا جو بنگال سروس کے ایک پنشنر تھے۔ اُنھوں نے اپنے رسالہ موسومہ "بغاوت ہند اور ہماری آیندہ پالیسی" کے صفحات ۱۳ تا ۱۷ میں حسب ذیل تحریر فرمایا ہے:۔

"عزم تعلیم اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں اور نسبتاً ہندو اُن کے سامنے طفلِ مکتب معلوم ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے مسلمانوں میں کارگزاری کی اہلیت زیادہ ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے سرکاری ملازمتیں زیادہ تر انہیں کو ملتی رہیں۔ اس طرح اُن کو سرکاری کاموں اور ملکی مصالح سے واقفیت کا موقع ملا اور اُن کی رائے کو وقعت حاصل ہوگئی"

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ ۱۸۵۸ء تک مسلمانوں کی کیا حیثیت باقی تھی مگر بدقسمتی سے مسٹر موصوف کے ہم خیال انگریزوں کے ذہن میں یہ بات جم گئی کہ "خلفائے راشدین کے عہد سے اب تک مسلمانوں میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا ہے۔ وہ آج تک ویسے ہی غیر متزلزل غیر روادار اور حد سے گزر جانے والے ہیں۔ اور وہ اُسی طرح عیسائیوں سے متنفر ہیں اور ہر ممکن ذریعہ سے اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کسی غیر مذہب والی حکومت کے ساتھ وفادار نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ قرآن اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اگر مسلمان حاکم کے علاوہ اور کوئی اُن کا فرماں روا ہو تو وہ خود کو ایسی حالت میں پاتے ہیں کہ جس پر راضی ہو جانا اُن کے ضمیر کے خلاف ہے۔ اس لیے اعزاز و مراعات سے اُنھیں خوش رکھنا ناممکن ہے۔ مگر اُنھیں نمائشی وفاداری کا ڈھب خوب آتا ہے۔ اور وہ موقعے کے منتظر رہتے ہیں۔ .... لیکن عیسائیوں کے ساتھ اس طبعی منافرت کے

علاوہ اور بھی وجوہ تھے جن کے باعث ہندوستان کے مسلمان ہماری بربادی کے خواہاں تھے۔ وہ بھولے نہ تھے کہ کئی پشت تک ہندوستان اُن کے زیرِ نگیں رہ چکا تھا۔ اور پھر اُنہیں یقین تھا کہ برطانیہ کی قوت اگر کامل طور پر برباد ہو گئی تو اُن کی عظمت رفتہ رفتہ واپس آ جائے گی۔ اور وہ دوبارہ ہندوؤں پر حکومت کر سکیں گے۔ ہندوستانی فوج میں جو بددلی پھیل رہی تھی اُس کو انھوں نے تاڑ لیا اور اپنی ریشہ دوانیوں سے اُس چنگاری کو بھڑکا کر آگ لگا دی۔"

غرض کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کا سارا الزام مسلمانوں کے سر تھوپا گیا۔ درآں حالیکہ اصلیت یہ ہے کہ خود سلطنت برطانیہ اُس کی ذمہ دار تھی۔ اس امر کو لفٹننٹ جنرل میک لیوڈ اینس نے اپنی کتاب "بغاوت فوج" میں ان الفاظ میں تسلیم کیا ہے:۔

"ملک کے لوگوں کی کثیر تعداد ہمارے تحت میں فتوحات سے یا جبریہ الحاق سے آئی تھی۔ حکمران خاندان تخت سے اُتارے گئے یا کچل دیئے گئے، بڑے خاندان ذلیل کئے گئے لوگوں کے اختیارات اور مناصب اور جاگیرادیں چھن جانے سے مصیبتیں نازل ہوئیں۔ ان حالات میں اس بارہ میں شک کرنا خلاف عقل تھا کہ ہمارے دشمنوں کی ایک جماعت تیار اور مرتب ہو گئی تھی۔"

بہر حال اصلی واقعہ جو کچھ بھی ہو اس غدر کا ادبار زیادہ تر مسلمانوں

پڑا اور انھیں ہر طرح برباد کیا گیا اور بقول مسٹر رسل کے مسلمانوں کو خنزیر کی کھالوں میں سی دیا گیا اور قتل کرنے سے قبل خنزیر کی چربی اُن کے بدن پر ملی گئی اور پھر انھیں جلایا گیا۔ (تمغہ کا دوسرا رُخ مصنفہ ایڈورڈ ٹامس صفحہ ۴۸۰)

اور آج غدر کے ستر سال بعد اس عملداری میں مسلمانوں کی حالت ہر اعتبار سے بالکل اُس کے برعکس ہے جو مسٹر ٹامس نے غدر کے وقت بیان کی تھی یعنی ارادہ کی مضبوطی، تعلیم، دماغی قابلیت، سرکاری عہدوں اور گورنمنٹ میں اثر ہونے کے اعتبار سے جو برتری اُنہیں ہندوؤں پر حاصل تھی۔ اب اُس کے بالکل برعکس نظر آرہا ہے۔ جس کی تفصیل آیندہ عرض کی جائے گی۔

۳و۔ مسلمانوں کی تعلیم گزشتہ ساٹھ سال سے مسلمانوں کی تمام تر توجہ اپنی قومی تعلیم کی طرف رہی ہے اور اُسی کو مسلمانوں نے اپنی دنیوی نجات کا ذریعہ سمجھ رکھا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نسبت کسی قدر وضاحت کے ساتھ عرض کیا جائے۔ یہ امر مسلم ہے کہ ابتدا سے مسلمان انگریزی تعلیم سے علیحدہ رہے۔ مگر تعجب ہے کہ مسلمانوں کے بعض لیڈروں نے مسلمانوں کے علیحدہ رہنے کو اس امر پر محمول کیا ہے کہ اُن میں قومی غرور تھا اور نیز تعلیم جدید اُن کی روایات اور اُن کی ضروریات کے مطابق نہ تھی۔ درانحالیکہ امر واقعی یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں نے قابل اعتراض طریقوں سے اسکولوں میں مذہب عیسوی کی تعلیم جاری کی۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی کے آخر میں چارلس گرانٹ نے اپنی کتاب میں جو اشاعت تعلیم کے بارہ میں انھوں نے

لکھی تھی صاف الفاظ میں تحریر کیا ہے۔ کہ :۔

"اس میں کلام نہیں کہ سب سے اہم تعلیم جو ہند و ہماری زبان میں پا سکتے تھے وہ ہمارے مذہب کی تعلیم تھی جو متعدد رسالہ جات میں آسان الفاظ میں درج ہے اور جو مکمل طریقہ سے انجیل مقدس میں موجود ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہندوستانیوں کی اخلاقی حالت حد درجہ خراب ہے اور اس لیے اُن کی سوسائٹی نہایت ذلیل ہے ۔ ان خرابیوں کی اصلاح قوانین کے نفاذ سے ہرگز نہیں ہو سکتی خواہ وہ قوانین کیسے ہی عمدہ کیوں نہ ہوں ۔ دراصل تمام خرابیوں کی جڑ اُن کے مذہبی مراسم ہیں ۔ جن کی روح اُن کے قوانین میں موجود ہے اور اُن کے جھوٹے ناپاک اور قابل مضحکہ مذہبی اصولوں میں مضمر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان تمام برائیوں کا واحد علاج یہ ہے کہ ہمارے علم کی روشنی ان لوگوں میں پہونچائی جائے ۔ جو تاریکی میں ہیں ۔ بالخصوص ہمارے ربانی مذہب کے خالص اور پاک اُصول اُنھیں بتائے جائیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس بارہ میں ہماری ذمہ داری اس لیے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ جس سچے مذہب سے ہم مستفیض ہوتے ہیں اُسے دوسروں تک کیوں نہ پہونچائیں" (تاریخ التعلیم مصنفہ جسٹس سید محمود ص۱۳)

مندرجۂ بالا اصول کو پیش نظر رکھ کر سلطنت کی طرف سے انگریزی تعلیم

کے لیے عیسائی مبلغین کی مالی اور مادّی امداد کی گئی۔ صوبہ بنگال میں ۱۸۵۲ء میں دو پادریوں کا اضافہ اس غرض سے کیا گیا کہ وہ پروٹسٹنٹ مذہب کی تعلیم دیں۔ اسی طرح مدراس میں کورٹ آف ڈائرکٹران نے مسٹر سوارٹزمشنری کو اسکولوں کی امداد کے لیئے مستقل سالانہ امداد دی۔ اور اسی قسم کے اور اسکولوں کی امداد کی منظوری دی۔" (صفحہ ۳۵ تاریخ التعلیم)۔

۲۹-۱۸۱۳ء میں آنریبل مسٹر الفنسٹن گورنر بمبئی نے مسئلہ تعلیم پر ایک یادداشت مرتب کی جس میں اونھوں نے اُس نقصان کو تسلیم کیا جو ملک کو انگریزوں کی ذات سے پہونچا۔ اُس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"ہم نے ہندوستانیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کردیئے اور ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اُس سے نہ صرف یہ کہ تعلیم کی طرف رغبت نہیں ہوتی بلکہ اُس سے قوم کا علم سلب ہوا جاتا ہے اور علم کے پچھلے ذخیرے نسیاً منسیاً ہوئے جاتے ہیں۔ اس الزام کے رفع کرنے کے لیئے کچھ نہ کچھ ہونا چاہیئے۔"

(صفحہ ۴۰ تاریخ التعلیم)۔

مسٹر ڈارون نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا:۔

"میں علانیہ نہیں تو بالواسطہ پادریوں کی حوصلہ افزائی کروں گا۔ کیونکہ اگرچہ مجھے گورنر صاحب سے اس بارہ میں اتفاق ہے کہ مذہبی امور میں امداد کرنے سے احتراز کیا جائے۔ تاہم جبتک کہ ہندوستانی لوگ عیسائیوں کی شکایت نہ کریں تب تک

اُن کی تعلیم کے مفید ہونے میں ذرا شبہ نہیں۔ اگر تعلیم سے اُن کی رایوں میں ایسی تبدیلی پیدا نہ ہو سکے کہ وہ اپنے مذہب کو لغو سمجھنے لگیں تاہم اس سے وہ زیادہ ایمان دار اور محنتی رعایا تو ضرور بن ہی جائیں گے۔" (تاریخ التعلیم صفحہ ۱۸۱)

حکام وقت کے اسی قسم کے طرز عمل سے مسلمان انگریزی تعلیم سے علیحدہ رہے اور ۱۸۳۵ء میں مسلمانان کلکتہ نے آٹھ ہزار آدمیوں کے دستخطوں سے اس مضمون کی شکایت کی درخواست پیش کی کہ انگریزی تعلیم کی اشاعت سے گورنمنٹ کا منشاء ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے اور نہ صرف مسلمانوں کو یہ شکایت تھی بلکہ ۱۸۵۲ء میں مدراس کے ہندوؤں نے بھی پارلیمنٹ میں اس مضمون کی درخواست دی کہ سرکاری اسکولوں میں یا امدادی اسکولوں میں انجیل کی تعلیم نہ ہونی چاہیئے وغیرہ وغیرہ۔ مگر باوجود ہندوستانیوں کے ان احتجاجات کے انگریزوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگی اور اُن کی پالیسی میں ذرہ بھر فرق نہیں آیا جیسا کہ مسٹر منگلس کی اُس تقریر سے ظاہر ہوتا ہے جو اُنھوں نے ۱۸۵۸ء میں پارلیمنٹ کے دارالعوام میں کی تھی اُس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھلایا ہے کہ سلطنت ہندوستان انگلستان کے زیر نگیں ہے تاکہ عیسیٰ مسیح کی فتح کا جھنڈا ملک ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے۔ ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت کل ہندوستان کو

عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیئے
اور اس میں کسی طرح تساہل نہ کرنا چاہیئے"

حکام وقت کے اس قسم کے طرز عمل کے باوجود ہندوؤں نے اپنے آپ کو رفتہ رفتہ زمانہ کے حسب حال بنایا اور انگریزی زبان سیکھی۔ البتہ مسلمان جن میں مذہبی حس زیادہ تھی انگریزی تعلیم کے حصول سے علیحدہ رہے اور نقصان اوٹھایا۔ اس امر کی تصدیق مس میو نے بھی کی ہے جو آج کل رجعت پسند اصحاب کی طرف سے وکالت کر رہی ہیں۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں :۔

"عیسائی مبلغوں کے طرز عمل سے مسلمان، انگریزی تعلیم کو مذہب عیسوی کی تعلیم کا مرادف سمجھتے تھے اور بمقابلہ ہندوؤں کے وہ اپنے بچوں کو پادریوں کے زیر اثر رکھنے پر راضی نہ تھے۔ اُن کے غرور اور اُن کی مذہبی وفاداری کو اس سے اشتعال ہوتی تھی۔ اس لیے وہ اس تحریک سے علیحدہ رہے"

(مادر ہند۔ صفحہ ۲۸۹)

دوسرا امر جو تعلیم کے متعلق ہے وہ یہ ہے کہ انگریزوں کی ابتدائی عملداری میں سرکاری دفاتر فارسی زبان میں تھے۔ اور معلوم ہوا ہے کہ شاہ عالم ثانی سے اور انگریزوں سے ۱۸۰۶ء میں جو معاہدہ ہوا اُس میں یہ قرار پایا تھا کہ دفاتر کی زبان فارسی رہے گی۔ مگر باوجود اس کے ایکٹ ۲۹ ۱۸۳۷ء پاس کرکے نافذ کیا گیا جس کی رو سے بقول مس میو کے :۔

"ایک چھوٹا سا بیج بویا گیا اور اس کے پھل سے ہم اب متمتع ہو رہے ہیں۔ یہ عدالتوں کی زبان کی تبدیلی تھی جو فارسی سے انگریزی کر دی گئی۔ ہندوستان کی تعلیم کو مغربیت کا رنگ دینے کا یہ لازمی نتیجہ تھا۔ یہ تبدیلی معمولی معلوم ہوتی تھی اور اس کے نتائج بھی معمولی تھے۔ اس کی مثال ایسی تھی جیسے کلہاڑی کی ایک ضرب لگائی جاتی ہے"

مسلمانوں نے اس تبدیلی پر سخت احتجاجات کیے اور فی الواقع یہ ان کے لیے سخت بربادکن تھی" (صفحہ ۲۰۹ مادرِ ہند)

بہرحال اس کلہاڑی کی ضرب نے مسلمانوں کو سخت مضمحل کر دیا۔ اور وہ مندرجہ بالا وجوہ سے جدید طرز تعلیم سے علیحدہ رہے اور اس لیے تعلیم میں پیچھے ہو گئے جس کو ۱۸۵۴ء میں کورٹ ڈائرکٹران نے محسوس بھی کیا تھا اور فرمایا تھا کہ :-

"مسلمانوں کی پسماندگی دور کرنے کے لیے اگر کوئی تجویز کی جائیگی تو ہم اس کی طرف خاص توجہ کریں گے کیونکہ وہ ہندوستان کی آبادی کے جزو اعظم ہیں"

اس تحریر کے سولہ سال بعد ۱۸۷۰ء میں لارڈ میو نے تعلیم میں مسلمانوں کی پسماندگی پر افسوس ظاہر کر کے ان کی ترقی کے لیے چند اصول قرار دیے۔ مگر ان پر کوئی عملدر آمد نہ ہوا۔ ۱۸۸۰ء کے قریب سر ولیم ہنٹر نے اس کا تمام الزام ہندوؤں کے سر تھوپا حالانکہ اس وقت

تمام نظام تعلیم سراسر انگریزوں کے ہاتھوں میں تھا۔ سر ولیم ہنٹر کے الفاظ یہ ہیں:۔

"چالاک ہندوؤں نے تمام ملک کو ایسے اسکولوں سے پاٹ دیا ہے جو خود اُن کی ضروریات کے مطابق ہیں۔ اور قطعاً مسلمانوں کے حسب حال نہیں ہیں۔ گورنمنٹ کے اسکولوں کی زبان ہندو ہے اور استاد بھی ہندو ہیں"

اسی طرح مدراس گورنمنٹ نے ۱۸۷۳ء میں گورنمنٹ ہند کے استفسار کے جواب میں اس امر کو تسلیم کیا تھا کہ:۔

"موجودہ طرز تعلیم کا ڈھانچ ہندوؤں کی ضروریات کے مطابق بنایا گیا اور مسلمانوں کو اس بارہ میں اس قدر زیادہ گھاٹے میں رکھا گیا کہ اسکولوں میں مسلمان بچوں کا کم تعداد میں ہونا حیرت انگیز نہیں ہے۔ بلکہ ان حالات میں محض اُن کا موجود ہونا ہی حیرت انگیز ہے"[1]

بہرحال حکام سلطنت نے مسلمانوں کی پسماندگی کا تمام الزام ہندوؤں کے سر تھوپا اور ۱۸۸۲ء کے تعلیمی کمیشن میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے تیرہ سفارشات کیں جن کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی خاص تعلیم کا بار لوکل اور میونسپل اور صوبجات کے مالیہ پر ڈالا جائے، دیسی مکاتب کی خوب امداد کی جائے۔ ہندوستانی زبان (یعنی اُردو) کے ذریعہ سے تعلیم دی جائے۔ وظائف دیئے جائیں فیسیں معاف کی جائیں۔ اور نارمل اسکو

[1] تاریخ تعلیم از سید محمود صفحہ ۱۵۵۔ انگریزی

قائم کیئے جائیں۔ افسران معائن مقرر کیئے جائیں اور ملازمتوں میں مسلمانوں کے واجبی حصہ کی طرف صوبجات کی حکومتوں کو خاص طور پر توجہ دلائی جائے

ان سفارشات پر عملدرآمد کرانے کے لیئے گورنمنٹ نے احکام جاری کئے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُن پر کوئی عملدرآمد نہیں ہوا۔ کیونکہ ۱۸۹۳ء میں یہ معلوم ہوا کہ صوبۂ بنگال میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے ۴۶۔ ڈپٹی انسپکٹروں میں سے کل دو نفر مسلمان تھے اور ۱۹۰ سب ڈپٹی انسپکٹروں میں سے ۹ مسلمان اور ۲۹۰۔ اُستادوں میں سے ۱۱ مسلمان تھے۔ اس کے بعد اس مسئلہ کی نزاکت کا افشا گورنمنٹ کی چٹھی مورخہ ۲۴ جون ۱۹۰۰ء سے ہوا جس کا یہ مضمون تھا کہ :-

"نقشہ جات کے ملاحظہ سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود گورنمنٹ کے بدیہی احکام کے ۲۹۲۔ اُستادوں میں سے صرف ۲۶ مسلمان ہیں"

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ جہاں تک عملی نتائج کا تعلق ہے صوبہ بنگال میں مسلمانوں کے لیئے گورنمنٹ کی امداد قطعاً بے سود اور بے کار ثابت ہوئی۔ علیٰ ہذا صوبہ متحدہ میں سر جیمس (حال لارڈ) میسٹن کی گورنمنٹ نے اس امر کو تسلیم کر لیا تھا کہ :-

"۱۸۸۳-۸۲ء کے تعلیمی کمیشن نے جو سفارشات مسلمانوں کے لیئے کی تھیں اُن کے مطابق ان صوبجات میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی جہاں کہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں مسلمانوں کا

تناسب محض اُن کی مردم شماری کے اعتبار سے قرار دیا
جاتا ہے"

اس کے بعد ۱۹۱۳ء میں مولوی کرامت حسین کی کمیٹی نے یہ تجربہ کیا
کہ ابتدائی اسکولوں میں مسلمان بچوں کی تعداد گزشتہ اٹھارہ سال میں
۲۲،۳۶ فی صدی سے مسلسل گرتی چلی آتی حتیٰ کہ ۱۰،۷۵ فی صدی رہ گئی۔
بالآخر گورنمنٹ نے کمیٹی مذکور کی سفارشات منظور کیں اور مسلمانوں
کے خاص اسکولوں اور مکاتب کے لیئے روپیہ کا انتظام کیا۔ مگر بقول خان بہادر
حافظ ہدایت حسین صاحب ایم۔ ایل۔ سی بیرسٹرایٹ لا کان پور کے کہ :۔

"سررشتۂ تعلیم نے اس اسکیم کو ابتدا سے مخالفانہ نظروں سے
دیکھا اور وہ اُسے لے پالک بچہ کی طرح سمجھتی۔ ہے اور محض اس کا
وجود اُسے خار گزرتا ہے"

خان بہادر حافظ صاحب موصوف نے یہ الفاظ اپنے خطبۂ صدارت
میں جو اونھوں نے ۱۹۲۶ء میں پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سامنے
بمقام فرخ آباد پڑھا تھا نہایت مایوسی کی حالت میں فرمائے تھے۔ یہ مایوسی
اُن کے حسب ذیل الفاظ سے عیاں ہوتی ہے :۔

"یہ اسکیم ناکام رہی۔ اسپیشل اسکولوں کی تعلیم گھٹیا ہو گئی اور
وہاں کی نگہداشت ناقص ہے .... مسلمانوں کی
تعلیم روز بروز گر رہی ہے"

ان تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے لیکر اس وقت تک

گورنمنٹ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے کمیشنیں اور کمیٹیاں مقرر کرتی رہی اور احکام جاری کرتی رہی تاہم حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یا تو گورنمنٹ اس قدر کمزور تھی کہ ماتحتوں سے اپنے احکام کی تعمیل نہ کرا سکی یا اس قسم کے احکام جاری کرتے رہنے سے دراصل اُس کا منشا کچھ اور تھا۔ اس کا پتہ پنجاب گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی سے چل سکے گا جس کو خان بہادر خورشید احمد صاحب ڈپٹی انسپکٹر مدارس نے ۳؍ اکتوبر ۱۹۲۸ء کے مسلم آوٹ لک لاہور میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ اُس کا اقتباس حسب ذیل ہے:۔

۵۴۔ پنجاب کی تعلیمی پالیسی | خان بہادر خورشید احمد صاحب موصوف نے تحریر فرمایا ہے کہ:۔

"اگر میں غلطی نہیں کرتا تو مقام رگبی کے مشہور طامس ارنلڈ کے صاحب زادہ مسٹر ارنلڈ وہ شخص ہیں جنھوں نے اس وقت سے ستر سال قبل ۵۷-۱۸۵۶ء میں اس صوبہ کی سب سے پہلی تعلیمی رپورٹ مرتب کی تھی۔ مسٹر ارنلڈ نے اُس وقت سررشتہ تعلیم کو مسلمانوں کے ہاتھوں میں پایا تھا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ بہ حیثیت معلمی کے میدان اُن کے ہاتھوں میں ہے۔ نقشہ جات سے اسکولوں میں مسلمان بچوں کی بہت زیادہ بیشی ظاہر ہوتی ہے۔ ہر امر سے بلاشک و شبہ واضح ہے کہ معلمی کے پیشہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہی

ایک خاص قابلِ لحاظ امر یہ ہے کہ مسلمانوں کے اسکولوں
میں فارسی پڑھنے کے لیئے اتنے بہت سے ہندو لڑکے
اُن پر اعتماد کر کے پڑھنے آتے ہیں۔ میں یہ بھی سمجھنے پر
مجبور ہوں کہ مسلمان طلبا ر کی جو تعداد پنجاب میں مسلسل
بڑھ رہی ہے وہ اسی اعتماد کا نتیجہ ہے اور اگر اس کو اپنی
حالت پر چھوڑ دیا جائے تو اُس سے گورنمنٹ کا تمام
زور مسلمانوں کی طرف پڑ جائے گا اور یہ ایسا میلان ہے
جسے بہت زیادہ روکنے کی ضرورت ہے۔"

اس کے بعد خورشید احمد خاں صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"مندرجہ بالا تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ صرف معلمی کا پیشہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھا بلکہ مسلمان طلبا ر کی تعداد بہت زیادہ تھی۔" یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوؤں کو اپنے مسلمان اُستادوں پر پورا اعتماد تھا۔ مگر مسلمان اُستادوں اور لڑکوں کی زیادتی اور ہندوؤں کا مسلمان اوستادوں پر اعتماد کرنا مسٹر ارنلڈ کو شاق گزرا۔ اِس لیے اونھوں نے یہ تجویز کیا کہ اس میلان کو روکنا چاہیئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر ارنلڈ کی اس پالیسی پر مسلسل عملدرآمد ہوتا رہا۔ چنانچہ سنہ ۱۸۶۰ء کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ کپتان فلر ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم نے لکھا کہ:۔

"مسلمان اُستادوں کی بیشی جو ان درس گاہوں میں ٹرننگ
حاصل کر رہے ہیں بالکل عیاں ہے ۴۳۴ مسلمان اوستاد

اور ۱۱۱ ہندو اور ۲ دوسری ذاتوں کے ہیں۔ ابھی جلد
اس نسبت کو مساوی کرنے کا کوئی موقعہ نہیں معلوم ہوتا۔
بجز انبالہ کے حلقہ کے دیسی زبان کی تعلیم ہر جگہ مسلمانوں کے
ہاتھوں میں ہے اور جب تک کہ وہ ہر دلعزیز ہیں۔ ہم اُن
کی جگہ دوسری قوم کے اوستاد مقرر نہیں کر سکتے۔ البتہ
افسران ضلع رفتہ رفتہ راستہ صاف کر کے تبدیلی پیدا
کرنے کی یہ صورت نکال سکتے ہیں کہ زیادہ ہندوؤں کو
ٹرننگ میں جانے کی ترغیب دیں اور اُنھیں ایسے اسکولوں
میں مقرر کریں جہاں شدت کے ساتھ مسلمان اوستادوں
کے لیئے اصرار نہ ہوگا

پھر خان بہادر موصوف فرماتے ہیں کہ مندرجۂ بالا عبارت پڑھنے کے
بعد اب اس مضمون کی توضیح کی چنداں ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے
بعد یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ ایک طرف تو مسلم اوستادوں کی تعداد تعلیم عامہ
کے صیغہ میں گھٹائی گئی دوسری طرف جو انگریزی اسکول ضلعوں کے صدر
مقامات میں قائم کیئے گئے وہ بالکل غیر مسلموں کے ہاتھوں میں دے دیئے
گئے۔ چنانچہ ضلع اسکولوں کے ہیڈ ماسٹروں کی فہرستوں سے معلوم ہوا
کہ ۳۲۔ ہیڈ ماسٹروں میں سے صرف تین مسلمان تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اگر نتائج کو صحیح حالت کا معیار قرار دیا جائے تو مسلمان اوستاد۔ اور
طلبار کی کمی تعداد کو مسٹر ارنلڈ کی پالیسی کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس کا

اتباع غالباً گورنمنٹ نے کیا.............................

یہ پالیسی اس قدر کامیاب ہوئی کہ پچیس سال کے عرصہ میں حالات بالکل تبدیل ہو گئے اور تعلیم سے مسلمانوں کا عنصر بالکل خارج ہو گیا - چنانچہ ۱۸۸۲ء سے ۱۸۹۰ء تک کے نقشوں سے واضح ہے کہ معائنہ کنندگان اور استاد سب کے سب ایک مذہب کے لوگ یعنی ہندو ہو گئے - کبھی کبھی کسی مسلمان کا نام جو شاذ و نادر نظر آتا تو وہ محض اس وجہ سے کہ اس وقت صوبہ سرحدی بھی پنجاب کے تحت میں تھا - اور وہاں ہندو اوستاد جانا پسند نہ کرتے تھے اس لیئے مسلمان وہاں بھیجے جاتے تھے "

مندرجہ بالا تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۵۶ء میں مسلمان سرشتہ تعلیم پر چھائے ہوئے تھے - ہندوؤں کو ان پر کامل اعتماد تھا اور باوجود ہندوؤں کی طرف سے کوئی شکایت نہ ہونے کے مسٹر ارنلڈ نے مسلمان استادوں کی تعداد گھٹانے کی کوشش کی - اس پر بھی ۱۸۶۱ء میں ۱۱۱ ہندو استادوں کے مقابلہ میں ۳۴۴ یعنی تین گونے اوستاد مسلمان تھے - پھر کپتان فلر بھی اسی چکر میں رہے کہ جب تک مسلمان اوستاد بکثرت ہیں انھیں کس طرح ہٹا کر ہندوؤں کو مقرر کریں - مگر رفتہ رفتہ گورنمنٹ کی پالیسی غالب آئی اور ۱۸۹۰ء تک مسلمان اوستادوں کا صفایا کر دیا گیا ۔

پھر یہ کہ مسلمانوں کا صفایا نہ صرف سرشتہ تعلیم میں کیا گیا بلکہ واقعات صاف بتا رہے ہیں کہ رفتہ رفتہ ہر محکمہ سے اسی طرح خارج کیا گیا - کہا یہ جاتا ہے کہ مسلمان تعلیم میں پسماندہ ہونے کی وجہ سے ملازمتوں میں کم ہوتے جاتے

ہیں۔ درآں حالے کہ جس وقت یہ چرچا شروع ہوا اُس وقت مسلمانوں کی
تعداد جملہ صیغہ جات ملازمت میں زیادہ تھی۔ اُس زمانہ میں تقررات انگریز
عہدہ داروں کے ہاتھوں میں تھے اور کوئی امتحانات مقابلہ بھی نہ تھے۔
اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کی اتنی کمی بھی نہ تھی کہ خالی شدہ عہدوں کو پر کرنے
کے لیے کوئی مسلمان نہ مل سکتا۔ مگر باوجود ان امور کے اور باوجود حکام
ذی شان کی خاص مہربانی اور سرپرستی کے جس کی وجہ سے مسلمان ہر جگہ
رقابت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں وہ رفتہ رفتہ ملازمتوں سے خارج ہوتے
رہے۔ اب سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہندوؤں نے خارج کیا یا اُن اصحاب نے
خارج کیا جن کے ہاتھوں میں تقرر کے اختیارات تھے۔ اور مسٹر ارنلڈ کی طرح
انھیں گوارا نہ تھا کہ مسلمانوں کی تعداد زیادہ رہے؟ اس سوال کا جواب
ہمیں دینے کی چنداں ضرورت نہیں۔ بلکہ خود ناظرین اس پہیلی کو بوجھیں۔
اسی سلسلہ میں یہہ عرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ پچھلی سلطنتوں کے زمانہ
میں بادشاہ کی طرف سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں کے لیے
تنخواہیں، وظیفے اور جاگیریں مقرر ہوتی تھیں جنکا اب بھی اُن کا وجود
ہندو اور مسلمان دونوں کی ریاستوں میں ہے۔ اور سرکاری فوج میں بھی
اُس کی علامات موجود ہیں۔ جہاں سپاہیوں کی دل داری کے لیے اماموں
وغیرہ کی تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ شاہ عالم کے معاہدہ
میں بھی یہ قرار پایا تھا کہ مذہبی امور میں عدالتوں کی امداد کے لیئے قاضی
اور پنڈت کے عہدے قائم رہیں گے۔ مگر سرکار انگریزی نے مذہبی

غیر جنبہ داری کا اعلان کر کے قاضیوں اور پنڈتوں کو تو صاف کر دیا لیکن پادریوں کے عہدے موجود ہیں جنھیں سرکاری خزانوں سے تنخواہیں ملتی ہیں۔ نہ معلوم یہ کیسی غیر جنبہ داری ہے؟

۵۵۔ صوبہ متحدہ میں مسلمانوں کے وفد کا انجام

پنجاب کی مندرجہ بالا مثال سے صاف ظاہر ہو گیا کہ گورنمنٹ نے جس امر کو دل سے چاہا اُسے کر دکھایا۔ پنجاب میں مسلمان اوستادوں کی تعداد جنھیں گھٹانی تھی وہ گھٹا کر چھوڑی برخلاف اس کے بنگال اور صوبہ متحدہ میں بظاہر تو وہ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے احکام جاری کرتی رہی مگر اُن پر کوئی عملدرآمد نہ کرایا گیا۔ البتہ بہت سے کمیشنوں اور کمیٹیوں میں جو سفارشات کی گئیں اُن کا سبق مسلمانوں کو خوب یاد ہو گیا۔ چنانچہ تعلیمی کانفرنسوں میں جو ریزولیوشن سال بسال پاس ہوتے ہیں اُن میں گورنمنٹ کو انھیں سفارشات کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ خود مجھے بحیثیت آنریری جوائنٹ سکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے یہ ریزولیوشن گورنمنٹ میں بھیجتے ہوئے عرصہ ہو گیا ہے مگر اُن کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اس حالت سے مایوس ہو کر ۱۹۲۴ء میں صوبہ متحدہ کے چند معزز مسلمانوں کا ایک وفد ہز اکسی لینسی سر ولیم میرس صاحب گورنر کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن کے سامنے اپنی طویل عرضداشت پیش کی جس میں صیغہ تعلیم میں مسلمانوں کی حق تلفیوں کو تفصیل کے ساتھ ظاہر کیا گیا۔ اُس کا جواب گورنر صاحب موصوف نے جو دیا وہ ہر مسلمان کے پڑھنے کے قابل ہے۔ اُس میں سے چند اقتباسات

ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :-

"جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کے اہم تعلیمی مسئلہ کو فرقہ وارانہ اور مذہبی تنازعات اور اختلافات کے طوفان سے دور رکھنا چاہیئے"

مگر سوال یہ ہے کہ تعلیمی امور میں جُدا گانہ حقوق طلب کرنے کا سبق مسلمانوں کو کس نے سکھایا۔ اس کا جواب ظاہر ہے کہ خود افسران گورنمنٹ نے سکھایا۔ جب کہ ۱۸۷۱ء اور اُس کے بعد ۱۸۸۲ء میں تعلیمی کمیشن نے مسلمانوں کے لیے کچھ سفارشات کیں اور جن پر عملدرآمد کرنے کا مطالبہ کرتے کرتے وہ اب انھیں حفظ یاد ہو گئی ہیں۔ آگے چل کر ہز اکسی لنسی نے فرمایا کہ :-

"اس صوبہ کے پرامن اور باقاعدہ نشو و نما کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُس میں رہنے والے دو بڑے فرقے ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں اور باہمی بدگمانی اور بے اعتباری کے اسباب کو دور کریں ...... میں اس دعویٰ کی تائید کسی طرح نہیں کرسکتا کہ جو جماعت اقلیت میں ہے وہ اُن شرائط کا تعین کرے جس پر وہ راضی ہو سکتی ہے یہ ایک ایسی دلیل ہے جو میرے سامنے بارہا پیش ہو چکی ہے۔ اگر اُس کا اطلاق کم تعداد جماعت پر ہو سکتا ہے تو تمام دوسری جماعتوں پر بھی ہونا چاہیئے اور

اُس حالت میں ہم اس لغویت میں پڑ جائیں گے کہ اکثریت
کی حفاظت کے طریقے بھی ایجاد کریں۔ ....
ہم سب کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر ہم کسی خاص جماعت کو کچھ
دیتے ہیں تو اُسی نسبت سے دوسری جماعتوں کو محروم کرنا
پڑتا ہے اور اب یہی صورت باقی رہتی ہے کہ تمام جماعتیں باہمی
گفتگو کے ذریعہ سے کسی متفقہ فیصلہ تک پہونچیں.......
اور یہ تمہارا کام ہے کہ باہمی بحث و مباحثہ اور استدلالات
سے اور بعض لیجسلیٹو کونسل میں خوش بیانی سے اپنے دعووں
اور مطالبوں کو تسلیم کراؤ۔"

۵۷۔ مسلمانوں کے تعلیمی مسئلہ کا حل

بہر حال گورنر صاحب کے اس ارشاد نے اس مسئلہ کو بالکل صاف کر دیا کہ تعلیم کے بارہ میں مسلمانوں کی جو کچھ بھی ضروریات ہوں اُن کے لیے وہ برادران وطن کے سامنے ہاتھ پھیلایا کریں۔ اتنے بڑے افسر کے ایسے صاف اور صریح جواب کے بعد اب سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم لوگ حکام کی خدمت میں کس امید پر حاضر ہو کر استدعا کئے جائیں۔ اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ تعلیم سے علیحدہ رہے وہ صرف انگریزی تعلیم کے متعلق ہے اور وہ بھی مذہبی امور کی وجہ سے جن کی تفصیل عرض کی گئی ہے۔ باقی رہا دیسی زبان کی تعلیم کے بارہ میں خود افسران کو تسلیم ہے کہ اس کا میدان مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھا۔ اور ہندو اُن کے سامنے

مثل طفل مکتب کے تھے اور انھیں مسلمانوں پر کامل اعتماد تھا۔ مگر یہی
حالت حکام وقت کو گوارا نہ ہو سکی۔ اور انھوں نے ایک کو گھٹا کر دوسری
جماعت کو بڑھایا۔ دونوں کے دلوں میں رقابتیں پیدا کیں حتیٰ کہ مسلمان
سررشتۂ تعلیم سے خارج کر دیے گئے۔ خارج ہو کر اب وہ گورنمنٹ کی
خدمت میں عرضداشتیں پیش کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس کی انھیں رفتہ
رفتہ عادت ہوئی اور عادت سے پھر بھیک مانگنا طبیعت ثانی بن گیا۔ اب
اس منزل پر پہونچکر انہیں معلوم ہوتا ہے کہ تمام ہندوستان میں اُن کی قوم
کے خواندہ لوگوں کی تعداد گر کر ۶۰ء۴ فی صدی رہ گئی اور برادران وطن کی تعداد
جن میں اچھوت اقوام شامل ہیں بڑھ کر ۱ء۹ فی صدی تک پہونچ گئی۔ اسی طرح
مسلمانوں میں انگریزی دانوں کی تعداد ۰۶ء۳ فی ہزار اور ہندوؤں میں
۰۷ء۶ فی ہزار ہے۔ اور اس بیکسی کی حالت میں انھیں حکم ہوتا ہے کہ وہ
اپنی حالت کو اُس جماعت کے رحم پر چھوڑ دیں جو غیر ہمدرد بنائی جا چکی ہے
اور اُسی کے سامنے دستِ سوال دراز کریں۔

باقی رہی انگریزی زبان میں علوم عامہ کی تعلیم اُس میں مسلمانوں کی حالت
اور بھی زیادہ بدتر ہے۔ مگر ہر امر میں پسماندگی سے مسلمانوں کو جو نقصان
پہونچا ہے اُس سے کہیں زیادہ نقصان اس غلط خیال سے پہونچا ہے کہ
حکام گورنمنٹ اُن کی تعلیم کے حامی اور مددگار رہیں۔ بدقسمتی سے اول تو
اُنھیں یقین دلایا گیا کہ گورنمنٹ اُن کے جداگانہ اسکول قایم کرے گی۔
اُن کے قومی مدارس کو مالی امداد دے گی۔ اُن کے لیے جداگانہ انسپکٹر

مقرر کرے گی۔ انھیں خاص وظائف دے گی، سرکاری مدارس میں اردو پڑھانے کے لیے استاد مقرر کرے گی۔ اِن وعدوں سے مسلمانوں کے دلوں میں امیدیں پیدا ہوئیں اور جب مشترک مدارس میں ان امور کا انتظام نہ ہوا تو انھیں مایوسی ہوئی اور انھوں نے سرکاری مدارس چھوڑ کر اپنے خاص مدارس کا انتظام کرنا چاہا۔ مگر خاص مدارس کا قائم کرنا بوجہ اُن کی مالی کمزوری کے اُن کے امکان سے باہر تھا۔ تاہم وہ اس کام میں لگے رہے اور کتنے ہمدردانِ قوم نے اپنی زندگیاں قومی مدارس چلانے میں صرف کر دیں اور اُن میں سے ایسے لوگ موجود ہیں جو مسلسل بیسیوں سالوں تک جان کھپانے پر بھی مدرسہ کی ایک عمارت مکمل نہ کر سکے اور کرایہ کے مکانوں میں اسکول چلا رہے ہیں۔ جن صوبوں میں سرکار کی طرف سے مسلمانوں کے جُداگانہ مدارس قائم ہوئے اُن میں روپیہ کم ملا اس لیے اسٹاف خراب رہا۔ غرضکہ ہر اعتبار سے مسلمانوں کی تعلیم برباد ہوئی اور اب سب سے بڑھکر یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں منافرت ہو جانے کی وجہ سے جب مسلمان بچے مشترک مدارس میں پڑھنے جاتے ہیں تو انھیں وہاں دھکّے ملتے ہیں اور بعض مقامات کی نسبت سُنا گیا ہے کہ ہندو اُستاد مسلمان بچوں کو اچھوتوں اور شودروں کے برابر بٹھاتے ہیں۔ اس حالت میں مسلمان ظاہر ہے کہ "ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے"۔ کاش انھیں کسی کا سہارا نہ ہوتا تو اُن کے بچے ہندوستان کی دوسری چھوٹی جماعتوں کے بچوں کی طرح مشترک مدارس میں بے کھٹکے پڑھا کرتے اور ملک کے مالیہ سے جو

تعلیم پر خرچ ہوتا ہے یکساں نفع اُٹھاتے -

اسی سلسلہ میں ایک واقعہ کا تذکرہ کرنا نامناسب نہ ہوگا - ۱۹۱۳ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک سفیر آگرہ میں دورہ کر رہے تھے - آگرہ سٹی اسٹیشن پر اُنھوں نے دیکھا کہ ایک ہندو اوستاد پرائیویٹ طور پر کچھ بچوں کو پڑھا رہا ہے - اُن بچوں میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے - اور مسلمان بچوں کے سامنے قرآن شریف کے پارے بھی رکھے تھے - سفیر صاحب نے تعجب سے پوچھا کہ ان بچوں کو قرآن شریف کون پڑھاتا ہے - ہندو اُستاد نے کہا کہ " یہ بچے میرے پاس اردو اور حساب پڑھتے تھے - ان کے والدین نے کہا کہ ان کا قرآن شریف رہا جاتا ہے - اس لیئے اوس کا انتظام ہم کسی دوسری جگہ کرنا چاہتے ہیں - اس پر خود میں نے قرآن شریف پڑھ کر ان بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا "

ممکن ہے کہ ہندو اُستاد سے قرآن شریف پڑھوانا شرعاً جائز نہ ہو مگر اس واقعہ سے یہ ضرور نتیجہ نکلتا ہے کہ زمانہ سابق میں علوم کی تعلیم یقینی طور پر " فرقہ وارانہ اختلافات کے طوفان سے " بالاتر تھی جس کی نصیحت سر ولیم میور نے مسلمانوں کو فرمائی ہے اور باوجود حکام وقت کی پالیسی پر عملدرآمد ہونے کے ملک میں اُس کے نشانات ۱۹۱۳ء تک موجود رہے -

بہرحال اب تو باہمی منافرت کا دور دورہ ہے اور اُس کے اثرات جو مسلمانوں پر پڑ رہے ہیں وہ اُن کے لیئے ناقابلِ برداشت ہیں اور اُن کا علاج یہ نہیں ہے کہ خود اُس جماعت سے رجوع کیا جائے جس نے

مسلمانوں پر دستِ شفقت پھیر کر اور اُن کی تعلیمی ترقی کے حامی بن کر انھیں
اس حال پر پہونچا دیا مسلمان پھر اُنھیں سے اپنے حقوق کی حفاظت کی استدعا
کریں جنھوں نے ٹھکرا کر انھیں ہندوؤں سے رجوع کرنے کی ہدایت کی۔
اگر اب بھی مسلمان اُسی طرز عمل پر کاربند رہے۔ تو وہ من جرب المجرب
حلت بہ الندامتہ کے مصداق بنیں گے۔ اِن حالات میں جو کچھ چارہ کار
ہے وہ محض یہ ہے کہ وہ کل ملک کے ساتھ حکومت خود اختیاری کا مطالبہ
کرنے میں شامل ہوں تاکہ اہل ہند کے اختیار میں زیادہ سے زیادہ روپیہ
تعلیم پر صرف کرنے کے لیئے آئے اور مثل انگلستان کے یہاں بھی ثانوی
تعلیم جبریہ اور مفت ہو اور اُس سے مسلمان بھی دوسری اقلیتوں کی طرح
مستفید ہوں اور اس طرح مسلمانوں کی تعلیم کا پیچیدہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے۔

۵۷۔ مسلمانوں کا مالی تنزل

اگر تعلیم اور ملازمتوں میں تنزل ہے اس سے کہیں زیادہ اہم مسلمانوں
کا مالی تنزل ہے جس میں تمام قوم مبتلا ہے۔ یہ امر واقعی ہے
کہ زمانہ سابق میں زمینداری اور صنعت و حرفت کے پیشے مسلمانوں کے
ہاتھوں میں تھے اور تجارت میں بھی مسلمان پیچھے نہ تھے۔ کپتان الگزنڈر
ہملٹن نے جو ہندوستان میں اٹھارہویں صدی کے شروع میں تجارت
کا کاروبار کرتے تھے لکھا ہے کہ سورت کے ایک تاجر مسمی عبدالغفور
کا سرمایہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سرمایہ کے برابر تھا۔ کاریگروں میں بھی مسلمانوں
کی تعداد زیادہ تھی۔ اور اب تک ہے۔ چنانچہ صوبۂ متحدہ میں مسلمان کاریگروں
کی تعداد ۴۴ فی صدی ہے۔ حالانکہ اُن کی مردم شماری صرف ۱۴ فی صدی

ہے۔ مگر انگلستان کے قوانین نے اور وہاں کے کثیر سرمایہ نے یہاں کی صنعت و تجارت کو برباد کر دیا۔ جس کا سب سے زیادہ اثر مسلمانوں پر پڑا۔ لیکن مسلمانوں کی مالی حالت کو جس چیز نے سب سے زیادہ نقصان پہونچایا وہ موجودہ عملداری کا سود کا قانون ہے۔ مسلمان زمیندار اور کاشتکار، تاجر اور کاریگر دیگر اقوام کے سرمایہ داروں کے مقروض ہیں۔ جس کی وجہ سے اُن کی زمینداریاں اور جائدادیں آئے دن نیلاموں پر چڑھی رہتی ہیں۔ اور یہ سب سود کے قانون کی وجہ سے ہے۔ خود انگلستان میں جب اس امر کا احساس ہوا کہ زیادتی سود سے تجارت کو نقصان پہنچا ہے تو سلطنت نے مختلف زمانوں میں شرح سود محدود کرنے کے قوانین پاس کیے۔ مثلاً:۔

۱۵۴۵ء میں قانون کے ذریعہ سے شرح سود ۱۰ فیصدی سالانہ تک محدود کر دی گئی

۱۶۲۴ء 〃 〃 〃 〃 ۸ 〃 〃 〃 〃

۱۶۵۱ء 〃 〃 〃 ۶ 〃 〃 〃 〃

اُس کے بعد 〃 〃 〃 〃 ۵ 〃 〃 〃 〃

اور جب انگلستان میں ہندوستان سے بے شمار روپیہ پہونچا اور اس سے بازاروں میں شرح سود بےحد گر گئی اور وہاں کسی قانون کی ضرورت نہ رہی تو ۱۸۵۴ء میں سود کی بندش کا قانون بالکل منسوخ کر دیا۔

خیر انگلستان میں جو کچھ کیا گیا وہ وہاں کے حسب حال تھا یا نہ تھا مگر انگریزوں نے اُسی نمونہ پر اس ملک میں بھی ۱۸۵۶ء میں شرح

سود اور سود در سود پر سے تمام بندشیں اُٹھادیں اور اُسے آزاد کر دیا۔ پھر زمینداریوں کو قابل رہن و بیع کر دیا تاکہ ضرورت کے وقت زمینداران کی کفالت پر قرضہ لے کر سرکاری مطالبات ادا کر سکیں۔ اس کے علاوہ زمانہ سابق میں بڑی زمینداریاں اولاد میں تقسیم نہ ہو سکتی تھیں بلکہ بڑے بیٹے کو بجنسہٖ مل جاتی تھیں۔ مگر لارڈ کارنوالس نے کورٹ ڈائرکٹران کی خواہش کے مطابق ۱۷۹۳ء میں اُس رواج کو مسترد کر دیا اور بہت بڑی زمینداریوں کو اپنے مفاد کے خلاف اور مضر سمجھ کر انہیں متوفی کی اولاد میں قابل تقسیم قرار دے دیا۔ اس قانون کا مضر اثر ہندوؤں پر کم پڑا۔ کیونکہ مشترک خاندان کے رواج کی آڑ میں اُن کی جائدادیں ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے محفوظ رہ سکتی تھیں مگر مسلمانوں کو اس قسم کا کوئی حیلہ نہ مل سکتا تھا۔ اس لئے اُن کی جائدادیں اس قانون کا شکار بن گئیں۔ غرض کہ اس قانون کی تبدیلی نے اور نیز سود کے قانون نے مسلمانوں کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ اور آج انہیں قوانین کی بدولت مسلمان فاقہ کشی میں مبتلا ہیں اور سندھ جیسے صوبہ میں جہاں مسلمانوں کی بہت زیادہ اکثریت ہے مسلمان رائے دہندوں کی تعداد ہندو رائے دہندوں کے مقابلہ میں جو نہایت اقلیت میں ہیں کم ہے۔ جس درجہ مسلمانوں کی بربادی اس ملک میں ہوئی اُس کا کسی صاحب کو اندازہ کرنا ہو تو "دفتر سود منہدم بدایو" سے اس مضمون کے متعلق رسالہ جات طلب کر کے اُن کا مطالعہ فرمائیں۔

بہرحال سر دست مسلمان قانون وقف علی الاولاد ۱۹۱۳ء پر عملدرآمد کر کے یا قانون انتقال آراضی کا اجرا کر کے اپنی جائدادوں کو محفوظ کرنے

کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اور جب سے کونسلیں جاری ہوئی ہیں۔ مسلمان ممبر متعدد بار شرح سود معین کرانے کے لیئے بل پیش کر چکے ہیں۔ اس بارہ میں سب سے پہلا بل خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم نے پیش کیا تھا مگر اُن کی مخالفت گورنمنٹ نے کی اس کے بعد صرف ۱۹۱۸ء کا قانون سود صوبۂ متحدہ میں پاس ہوا۔ جس سے حالات میں قدرے تبدیلی پیدا ہوئی پھر چند سال ہوئے کہ میر مقبول محمود نے سود کا حساب باقاعدہ رکھنے کے بارہ میں پنجاب کونسل میں ایک مسودۂ قانون پیش کیا۔ اوّل تو برادران وطن نے اُس کی مخالفت کی۔ مگر چونکہ ہندوؤں کی بڑی جماعت کو بھی اُس قانون سے فائدہ تھا۔ اس لیے انجام کار چند ترمیمات کے ساتھ وہ رضامند ہو گئے اور وہ قانون کونسل میں پاس ہو گیا مگر گورنمنٹ نے اُسے یہہ کہہ کر نامنظور کر دیا کہ خود اُس کی طرف سے ایک زیادہ مفید قانون پیش ہو گا۔ اس کو عرصہ ہو چکا مگر ہنوز روز اول ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ سیاسی مصلحتوں کی بنا پر مسلمانوں کے مفید مطلب کوئی مسئلہ چھیڑ دیا جائے جیسا کہ سائمن کمیشن کی عین آمد کے وقت سندھ میں قانون انتقال آراضی کا مسئلہ پیش کیا گیا۔ جس کی سخت مخالفت ہندوؤں نے کی۔ مگر واقعہ یہہ ہے کہ یہ چیزیں نابالغوں کے کورٹ آف وارڈس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں اور انتقال جائداد روکنے کے لیئے محض عارضی تدابیر ہیں۔ ملک کا حقیقی نفع اسی امر پر مبنی ہے کہ ملک میں سرمایہ کی فراوانی ہو جس سے ملک میں شرح سود گھٹے۔ اور قرض لینے والے کاریگروں اور دوکان داروں کو سرمایہ پر سود ادا کرنے کے

بچا اپنے لیے کچھ بچ سکے۔ آج کل چونکہ کاریگروں اور دوکان داروں کی حالت مخدوش ہے اس لیے یہاں کے مہاجن اپنے سرمایہ کی حفاظت اسی میں سمجھتے ہیں کہ جائدادیں مکفول اور رہن رکھیں ۔ جب ملک میں سرمایہ کی فراوانی ہوگی اور شرح سود گھٹے گی تو روپیہ زیادہ تر صنعت و تجارت میں لگیگا۔ اور اُس سے مسلمانوں کو حصہ رسد نفع ہو پہنچیگا ۔ مگر یہ صرف اُس وقت ممکن ہے کہ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری حاصل ہو اور اہلِ ہند نو آبادیات کی طرح اپنی صنعت و تجارت کی حفاظت کے قوانین بنا کر سب سے اوّل اپنے ملک سے باہر روپیہ جانا بند کر سکیں ۔

۵۸ ۔ مسلمانوں کا سیاسی تنزل

سب سے آخر مگر سب سے اہم مسلمانوں کی سیاسیات کا مسئلہ ہے ۔ مگر اس مسئلہ پر غور کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غدر سے پہلے مسلمانوں کی حالت کا محاسبہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ وہ اُس وقت کس حال میں تھے ۔ اس بارہ میں مسٹر طامس ہیرنگٹن کا قول نقل کیا جا چکا ہے جس کے ایک جزو کے الفاظ یہ ہیں کہ :۔

" مسلمان اپنے ارادہ کی مضبوطی، تعلیم اور دماغی قابلیت کے اعتبار سے ہندوؤں پر بدرجہا فائق تھے ۔ اور ثانی الذکر اُن کے ہاتھوں میں بچوں کے مانند تھے"۔ مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا غدر کے مظالم نے مسلمانوں کی برتری کا بالکل خاتمہ کر دیا۔ ذیل کے ایک واقعہ سے معلوم ہوگا کہ غدر میں اُن پر کس قدر مظالم ہوئے :۔

" مسٹر موبری طامس نے سر ہنری کاٹن[1] سے چند قیدیوں کی نسبت بیان کیا

---

[1] کاٹن" انڈین اینڈ ہوم میموارس صفحہ ۱۴۳

جو انھوں نے گرفتار کئے تھے کہ شام کے وقت ایک سکھ اردلی ان کے خیمہ کے پاس آیا اور سلام کرکے ان سے کہا کہ حضور ملاحظہ فرمائیں کہ ہم نے قیدیوں کے ساتھ کیا عمل کیا ہے۔ اس پر وہ چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اردلی روم پر جاکر ان بدبخت مسلمانوں کا تماشہ دیکھا جو آخری سانس لے رہے تھے۔ یہ لوگ ننگے بدن زمین سے بندھے پڑے تھے۔ سر سے پاؤں تک ان کے جسموں کا ہر حصہ تپتی ہوئی سلاخوں سے جلایا گیا تھا۔ ان کی اس تکلیف کا خاتمہ اس افسر نے اس طرح کیا کہ خود اپنے ہاتھ سے ان کی کھوپڑیاں توڑ کر بھیجا نکال باہر کیا۔ یہ قصہ سن کر میں نے کہا غضب خدا کا۔ پھر کیا ہوا؟ اس کا جواب ملا۔ کچھ نہیں" (۱) گویا یہ ایک معمولی واقعہ تھا۔

یہ واقعات حکمراں جماعت میں سے بعض اصحاب کے لئے خواہ کیسے ہی حق بجانب کیوں نہ ہوں مگر اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ان سے مسلمان حد درجہ خائف، پست ہمت اور بزدل ہوگئے اور انھوں نے مسلمانوں کی سیاسی روح کو بالکل مردہ کردیا۔ اور جیسا کہ سابق میں عرض کیا گیا ہے۔ جب ملک میں سیاسیات کا دور شروع ہوا تو مسلمان لیڈروں نے اپنی قوم کی اسی میں عافیت سمجھی کہ اسے سیاسیات سے بچایا جائے۔ البتہ ایک اور قسم کے سیاسیات ہیں جن کی تعلیم خود حکام انگریزی نے مسلمانوں کو دی اور وہ بیرونی ملک کی سیاسیات ہیں۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی ممالک سے ایک مذہبی تعلق تھا۔ لیکن وہ تعلق صدیوں تک ہندوستان میں خود اپنی قوم کے بادشاہوں کے زیر سایہ رہنے سے

کمزور ہو گیا تھا۔ مگر انگریزی سلطنت نے اپنی اغراض کے لیئے مسلمانوں کے ان جذبات کو بھڑکا کر ضرورت کے وقت اُن سے نفع اُٹھایا۔ مثلاً۔

(۱) اٹھارہویں صدی کے آخر میں جب سلطان ٹیپو نے فرانسیسیوں کی طرفداری میں انگریزوں کی مخالفت کی تو انگریزوں نے سلطان ٹرکی کا ایک سفارشی خط منگا کر سلطان ٹیپو کے پاس بھیجا اور اُس کی نسبت لارڈ ہاسٹنگز نے سلطان ٹیپو کو یہ لکھا کہ

"میں اب آنجناب کے پاس اس خط کو بھیجتا ہوں امید ہے کہ آپ اس کو اُسی مودبانہ توجہ کے ساتھ پڑھیں گے جس کا وہ مستحق ہے"

سلطان ٹیپو نے اس خط کی تعمیل میں انگریزوں کی مخالفت ترک کردی مگر انگریزوں نے اس کے بعد خود سلطان ٹیپو پر چڑھائی کی تیاری کی جس پر سلطان ٹیپو نے سلطان ٹرکی کو یہ لکھکر بھیجا کہ :۔

"انگریز میرے ساتھ لڑائی کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کیلیئے اُنھوں نے فوج اور اسلحہ جمع کیئے ہیں۔ اس لیئے میں ان کے خلاف اعلان جہاد کرنے پر مجبور ہوں" (ماخوذ از رسالہ خلافت اور انگلستان مصنفہ ڈاکٹر سید محمود)

(۲) ڈاکٹر سید محمود نے رسالہ مذکور میں لکھا ہے :۔ کہ

"۱۸۵۷ء کے ہنگامہ عظیم میں گورنمنٹ برطانیہ نے سلطان عبدالمجید سے اس مضمون کا فرمان حاصل کرنے کا انتظام کیا تھا

کہ مسلمانانِ ہند انگریزوں سے صلح کرلیں کیونکہ وہ خلیفہ کے
دوست ہیں۔ اس فرمان نے ہندوستان کی مسلمان
آبادی پر بڑا اثر کیا۔"

(۳) اسی طرح جنگ کریمیا میں اور ۱۸۵۴ء کی مشہور لڑائی میں۔
انگریزوں نے ہندوستان میں ترکوں کی تائید میں
اشتہارات جاری کرائے چندے کرائے۔ اُس وقت
تک مسلمانانِ ہند محض مذہبی خیال سے عرب کی عظمت
کرتے تھے اور وہاں کے تحایف کو تبرکات سمجھ کر آنکھیں۔
آنکھوں سے لگاتے تھے مگر اُن کے نزدیک عرب کی کوئی
سیاسی اہمیت نہ تھی۔ البتہ وطنیت کے اعتبار سے
ترکستان ایران اور افغانستان سے جہاں سے بکثرت مسلمان
آئے تھے محبت رکھتے تھے اور اپنے آپ کو وہاں کے مشہور
شہروں سے منسوب کرتے تھے مثلاً غزنی ترمذ اور شیراز سے
آنے والی نسلیں اپنے کو غزنوی اور ترمذی اور شیرازی کہتی تھیں
ہندوستان میں سکونت پذیر ہونے کے بعد ایک اپنے کو
ملتانی لکھتا تھا تو دوسرا سندھی۔ کوئی خیرآبادی لکھتا تھا تو دوسرا
اجمیری۔ مگر ترکوں کے تاریخی لٹریچر اور اُن کے ملک سے
مسلمانوں کو نہ مذہبی تعلق تھا اور نہ وطنی مناسبت تھی اور
ہندوستان کے مسلمان وہاں کے شہروں یا انسٹی ٹیوشنوں سے

اپنے آپ کو کبھی منسوب نہ کرتے تھے۔ البتہ ترکوں کے ساتھ
ہندوستان کے مسلمانوں کی دوستی میں انگریزوں کے
پیش نظر بہت سے فوائد تھے۔ منجملہ اُن کے اس دوستی میں
ترکوں سے انگریزوں نے جزیرۃ العرب کا ایک حصہ یعنی عدن
حاصل کرلیا اور ترکوں کو روس سے مصروف پیکار رکھ کر اُس کے
حملوں سے ہندوستان کو محفوظ رکھا۔

اس قسم کے فوائد کی بنا پر انگریزوں نے پوری ایک صدی تک ترکوں
کی محبت کے جذبات مسلمانوں میں مشتعل کیے، حتیٰ کہ مسلمانان ہند ترکوں کے
بادشاہ کو جس کو وہ کسی زمانہ میں محض شاہ روم یا سلطان روم کہا کرتے تھے
خلیفۃ المسلمین اور اپنا قومی اور مذہبی سردار سمجھنے لگے اور جمعہ کے خطبوں میں
سلطان کا نام پڑھنے لگے۔ اور سلطنت کی خوشنودی کے لیے صلیب اور
ہلال کو یک جا کر کے اُسے اپنا قومی نشان بنایا۔ سلطنت مغلیہ کے زمانہ میں
ہندوستان کے تمام باشندوں کا درباری لباس ایک تھا اور اس کا
اثر تمام ملک پر یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان سب کے سب پگڑی باندھتے۔ یا
ایک ہی قسم کی ٹوپیاں اوڑھتے تھے۔ مگر انگریزوں کی سرپرستی میں ترکوں
کی محبت بڑھنے سے تعلیم یافتہ مسلمانوں نے ترکوں کا لباس اختیار کرلیا جس سے
پُرانے خیال کے مسلمان اگرچہ نفرت کرتے تھے مگر انگریز حکام چونکہ اس سے خوش
ہوتے تھے اور ترکی ٹوپی اور ترکی کوٹ پہننے والوں سے اچھی طرح ملتے
تھے اس لیے قوم میں وہی لباس مقبول ہوگیا جو اُنھیں ہندوستان

کی دوسری قوموں سے بھی ممتاز کرتا تھا اور اس لیے آگے چل کر وہ مسلمانوں کا قومی لباس بن گیا اور ہندوؤں کو اُس کے مقابلہ میں فیلٹ کیپ اختیار کرنی پڑی۔

مگر ۱۸۸۲ء کے قریب مسلمانوں کی بدبختی کا ایک جدید دور شروع ہوا جب کہ انگریزوں نے اپنی سیاسی ضروریات کی وجہ سے مصر پر قبضہ کرنا مناسب سمجھا۔ اُن کے خلاف عربی پاشا نے مصریوں میں قومیت اور آزادی کی روح پھونکی اور اب ترکوں کے بارہ میں انگریزوں کی پالیسی بدل گئی۔

انگریزوں کی پہلی پالیسی نے جو ترکوں سے دوستی کے زمانہ میں اختیار کی گئی تھی۔ ہندو مسلمانوں کے درمیان ایک قسم کی مغایرت پیدا کر دی تھی۔ اب جب انگریز ترکوں سے ناراض ہو گئے تو مسلمانوں میں دو سیاسی جماعتیں ہو گئیں۔ ایک وہ لوگ جو غدر کے بعد انگریزوں کی قوت کا استعمال دیکھ چکے تھے اور اُس سے مرعوب تھے۔ اور محض انگریزوں کی وفاداری میں اپنی قوم کی عافیت سمجھتے تھے۔ ان لوگوں نے ترکوں کی محبت کو انگریزوں کی خوشنودی پر نثار کر دیا۔ دوسرے وہ لوگ تھے جو ترکوں کی محبت کو جو کئی پشتوں سے اُن کے دلوں میں جاگزیں کی جا چکی تھی نہ نکال سکے اور بعد کے مسلسل واقعات سے وہ سمجھنے لگے کہ ایشیا میں اسلامی ممالک کا دشمن انگریزوں سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے اور جس کا ظہور جنگ ہائے یونان، طرابلس بلقان اور جنگ عظیم کے زمانہ میں ہو گیا۔ غدر کے واقعات کے بعد مسلمانانِ ہند نے اپنا مسلک یہ قرار دیا تھا کہ وہ سیاسیات سے کنارہ کشی اختیار کریں گے۔ چنانچہ اُن کے ہر قومی مجلس کے قواعد کے عنوان میں لکھا جاتا تھا

"اس مجلس کو سیاسیات سے کچھ تعلق نہ ہوگا"۔ مگر سلطنت برطانیہ نے اپنے اغراض کے لیئے مسلمانوں کے دلوں میں ترکوں کی محبت پیدا کر کے انہیں بیرونی سیاسیات کا چسکا لگا دیا اور جب مصر کے قبضہ کے سلسلہ میں انگریزوں کا ترکوں سے بگاڑ ہوگیا تو وہی خوشنما ترکی ٹوپی مشتبہ اور مخالفانہ نظروں سے دیکھی جانے لگی اور پبلسٹی ڈپارٹمنٹ کے ایک رسالہ موسومہ "مسئلہ خلافت پر براہ راست گفتگو" میں خلافت کی تحریک کی نسبت لکھا گیا کہ:۔

"یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ مسلمانانِ ہند کا سلطان ترکی کو اپنا خلیفہ قرار دینا ایک جدید امر ہے اور جو صرف پچاس سال سے ہے اور یہ خیال پین اسلامک تحریک کے نشو ونما سے پیدا ہوا ہے اور اس دعویٰ کی کوئی تاریخی بنیاد نہیں ہے کہ خلافت کی بنا پر دنیوی امور میں مسلمانانِ ہند پر سلطان ٹرکی کی اطاعت لازم آتی ہے"۔

(خلافت اور انگلستان از ڈاکٹر سید محمد محمود صفحہ ۲)

اب سوال یہ ہے کہ سلطان ٹیپو کے نام سب سے پہلا فرمان کون لایا اور مسلمانانِ ہند کو دنیوی امور میں ترکوں کی اطاعت کا سبق کس نے سکھایا۔ اُس وقت تک تو بقول آپ کے پین اسلامزم کی تحریک کا پتہ بھی نہ تھا۔ مگر اس سلسلہ میں ایک تکلیف دہ امر یہ ہوگیا کہ انگریزوں نے مسلمانوں کے دلوں میں ممالک غیر کی محبت کے غیر معمولی جذبات پیدا کر کے اُن کے اور ہندوؤں کے درمیان ایک بلند دیوار حائل کر دی اور پین اسلامزم کی نسبت حکومت کے

پروپیگنڈے سے ہندو سمجھنے لگے کہ مسلمان ہند، ہندوستان کو اپنا وطن نہیں سمجھتے۔ اس طرح ایک طرف تو برادران وطن انھیں مخالفانہ نظروں سے دیکھنے لگے اور دوسری طرف حکام وقت اُن کی وفاداری پر شبہ کرنے لگے مگر مسلمانوں کے اصلی جذبات کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُن کی روایات کی رو سے سب سے پہلے پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام اسی ملک کے جنوبی حصّہ میں مدفون ہیں اور آٹھ سو سال سے اُن کے بزرگان دین اور آباؤ اجداد یہیں دفن ہوتے چلے آئے ہیں جنھیں چھوڑ کر وہ کہیں نہیں جا سکتے اور باوجود ہر قسم کے موانع کے ہندوستان کو اپنا وطن سمجھکر ملکی بہبودی کی تحریکات میں کم و بیش ہمیشہ شریک رہے۔ چنانچہ کانگریس کے پریسیڈنٹوں میں مسلمانوں کی تعداد سات تک پہونچ چکی ہے۔ اور ترک موالات میں مسلمانوں نے جو نمایاں حصّہ لیکر اُس تحریک میں جان ڈال دی وہ تو کسی پر پوشیدہ نہیں ہے۔

ہمارا خیال تو یہ ہے کہ محض مسلمانوں کے تذبذب نے جو حکام سلطنت کے طرز عمل نے اُن میں پیدا کر دیا اُنھیں تنزل کے اس درجہ پر پہونچا دیا گزشتہ پچاس سال میں بیسیوں ایسے واقعات پیش آئے کہ مسلمانوں نے اپنی وفاداری کا صلہ پانے کی توقع میں اپنی قسمت کو حکام وقت سے وابستہ کر دیا۔ مثلاً تقسیم بنگالہ کی تحریک میں مسلمانوں نے نمایاں حصّہ لیا مگر اُس پر عملدرآمد ہوتے ہی وہ منسوخ کر دیا گیا اور بنگال کے ہندوؤں کی شورش کی وجہ سے وہ امر جس کی نسبت حکام وقت نے پختگی کے ساتھ

کہہ دیا تھا کہ اُس میں تبدیلی نہ ہو سکے گی تب بھی وہ پلٹ دیا گیا جس سے مشرقی بنگالہ کے مسلمان اُدھر ہی لٹکے رہ گئے۔ اسی طرح صوبہ سرحدی کے وفادار مسلمان اصلاحات سے محروم رکھے گئے۔ صوبہ متحدہ کی کونسل میں مسلمانوں نے ڈسٹرکٹ بورڈ کے قانون کی مذہبی بنا پر مخالفت کی اور احتجاج کے طور پر سب مسلمان کونسل چھوڑ کر چلے گئے تاہم گورنر صاحب نے اُس قانون کی منظوری دے دی۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگوں کو اس امر کا اندازہ ہی نہیں کہ اس سلطنت کا نظام اس قسم کا ہے کہ اُس میں کسی فرد یا گروہ کو ایسے کامل اختیارات حاصل نہیں کہ اُن کے وعدہ وعید پر بھروسہ کیا جا سکے۔ دراصل انگریزی نظام سلطنت مثل ایسی ایک مشین یا آلہ کے ہے جس میں نہ روح ہے اور نہ ضمیر ہے اُس مشین کے چیف انجینیر انگلستان میں رہتے ہیں۔ اُنھیں ہندوستانیوں سے نہ کوئی واسطہ پڑتا ہے اور نہ اُن سے کوئی ہمدردی ہے اور جس قدر تعلق انھیں اس ملک سے ہے وہ محض ذاتی نفع پر مبنی ہے۔ جو مینجر اُس کے چلانے کے لیے ہندوستان بھیجے جاتے ہیں اُنھیں اُس مشین میں تبدیلی کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے اگر اُس میں وہ زیادہ دخل دیتے ہیں تو اُنھیں واپس بلا لیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ مینجروں میں جب کسی پر کوئی مشکل آن پڑتی ہے تو وہ دفع الوقتی کے طور پر جو مناسب سمجھتا ہے وہی طریقے اختیار کر لیتا ہے۔ اور جب وہ مشکل رفع ہو جاتی ہے تو اپنے مددگاروں کے ساتھ اُسے اتنی ہی ہمدردی باقی رہ جاتی ہے جتنی کہ ایک انجینیر کو اپنے وقتی اوزاروں سے ہوتی ہے۔ اور جنھیں کام

کر لینے کے بعد وہ ریتے کے ڈھیر پر ڈال دیتا ہے۔ بجنسہ وہی برتاؤ حکام گورنمنٹ کا ہندوستانیوں کے ساتھ ہے۔

مثلاً یہ امر مسلّم ہے کہ زمینداروں سے زیادہ کوئی جماعت حکومت وقت کی بہی خواہ اور اطاعت شعار، نیاز مند اور دست نگر نہیں ہے مگر ۱۹۲۶ء میں جب صوبہ متحدہ کی کونسل میں قانون لگان پر مباحثہ ہو رہا تھا تو گورنمنٹ کے افسروں نے اپنے وفادار زمینداروں کے مقابلہ میں سوراجیوں سے میل کرکے زمینداروں کو شکست دے دی۔

اسی طرح حال میں بنگال کونسل کے ممبران گورنمنٹ نے سوراجیوں سے مل کر مسلمان کاشتکاروں کے حامیوں کو شکست دے دی یہ وہ واقعات ہیں جن سے ہندوستان کی کمزور اقلیتوں کو سبق لیکر اپنے لیے ایک راہ عمل تجویز کرنا چاہیئے اور اپنی ایک معیّن پالیسی قرار دے کر اُس پر یکسانیت کے ساتھ عملدرآمد کرنا چاہیئے۔ اور اس خیال کو اپنے سروں سے نکال دینا چاہیئے کہ خاص حقوق اور خاص مراعات سے اونہیں کوئی مستقل فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ دراصل خاص مراعات تو بمنزلہ افیون کے ہیں جو عارضی طور پر کسی سخت تکلیف کو رفع کر دیتی ہے۔ خود لارڈ میکالے نے موجودہ نظام سلطنت کو پوست سے تشبیہ دی ہے جس کا عرق پینے کا اثر بقول اُن کے یہ ہوتا ہے کہ انسان کی تمام جسمانی اور دماغی قوتیں سلب ہو جاتی ہیں اور وہ شخص مسلوب الحواس ہو کر رہ جاتا ہے۔ خدانخواستہ ابھی مسلمان اُس درجہ پر تو نہیں پہونچے ہیں مگر ایک غیر ملک میں رہنے والی قوم کی سرپرستی نے دُنیا کی مشہور بہادر قوم کو

اس درجہ پر تو یقینی طور پہ پہونچا دیا ہے کہ جن صوبجات ہیں اُن کی اکثریت ہے، وہاں بھی ایسے اصحاب موجود ہیں جو اپنے کم تعداد ہمسایوں سے ترساں و لرزاں ہیں اور جداگانہ انتخاب اور مُعیّن نشستوں اور حفاظتی قوانین اور مراعات کے مطالبات کرکے کل ملک کو آگے بڑھنے سے روکتے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کل ملک کا افلاس روز بروز بڑھتا چلا جائے۔ اور اُس کا الزام مسلمانوں کے سر پہ ہے۔ بے شک خاص مراعات کی افیون چھوڑنے میں جب کہ پچاس سال سے مسلمانوں کو اُس کی عادت ہو چکی ہے۔ کچھ زمانے تک تکلیف ہو گی مگر ابھی وقت ہے کہ عارضی تکلیف کو برداشت کرکے متقل فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور کل جسم کو ہلاکت سے بچایا جائے۔

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ ذہنیت کی وجہ سے ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے پہ اعتبار نہیں اور دونوں جماعتوں میں ایسے اصحاب موجود ہیں جو مخلوط انتخاب جاری ہونے اور ہندوستان کے لیے نوآبادیات کا مرتبہ ملنے یا اہلِ ہند کے ہاتھوں میں عدالتیں، پولیس اور مالیہ کے اختیارات آجانے کو اُس وقت تک ملتوی کرنا چاہتے ہیں۔ جب تک کہ دونوں کی ذہنیت نہ بدل جائے۔ مگر اس حالت پہ پہونچکر بھی اگر ذہنیت بدلنے کا انتظار کیا گیا تو کل ہندوستانیوں پہ "تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود" کی مثال صادق آئے گی۔ ذہنیت بدلنے کا انحصار بھی تو اسی امر پہ ہے کہ اقلیتوں کی نشستیں مخصوص

کر کے مخلوط انتخاب جاری کیا جائے اور اُس کے ساتھ حکومت خود اختیاری حاصل ہو۔ مخلوط انتخاب جاری کیے بغیر ذہنیت بدلنے کا انتظار کیا جائے گا تو غالباً قیامت تک یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکے گا۔ یہ تو ایک قسم کا دور تسلسل یا بھول بھلیاں ہے جس میں پھنس کر ہندوستان اوس سے کبھی نہیں نکل سکتا۔

مگر ہندوستان کی مختلف اقوام کو یہ امر مدنظر رکھنا چاہیے کہ ایسے بے بنیاد اوہام اور شکوک کا ملک و قوم کو کس قدر کثیر تاوان دینا پڑتا ہے۔ وہ تاوان یہ ہے کہ جو منٹ گزر رہا ہے اُس میں مختلف صورتوں میں ہندوستان سے انگلستان کو کثیر مقدار میں روپیہ کھنچا چلا جا رہا ہے مسٹر ولسن کے حساب سے ہندوستان سے انگلستان کو ۳۵ ملین پونڈ سالانہ جاتا ہے۔ اس کے حساب سے ۲۶ ½ کروڑ سالانہ یا ۱۲ ½ لاکھ روپیہ روزانہ اس غریب ہندوستان سے باہر باضابطہ جاتا ہے اور تجارت اور دوسرے طریقوں سے جو جاتا ہے اُس کا تو شمار نہیں ہو سکتا اور اسی طرح اُس وقت تک جاتا رہے گا۔ جب تک کہ ہندو مسلمان دونوں مل کر سلطنت وقت سے نوآبادیات کی حکومت حاصل نہ کریں۔ اگر کچھ اصحاب واقعی سمجھتے ہیں کہ اس قدر روپیہ باہر جانے سے اُن کا کوئی نقصان نہیں ہے تو شوق سے وہ حکومت خود اختیاری کی مخالفت کریں۔ البتہ اگر وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ حکومت خود اختیاری مل جانے سے ہندو مسلمانوں میں سخت کشت و خون ہوں گے تو ہم ادب سے عرض کریں گے کہ کشت خون تو اب بھی ہوتے

ہیں اور جب تک دنیا قائم ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ فرق صرف اس قدر ہوگا کہ آج کل کی لڑائیاں بھوکے پیٹ لڑی جاتی ہیں اور حکومت خود اختیاری ہو جانے پر پیٹ بھروں کی لڑائیاں ہوا کریں گی۔ ان میں جو صورت پسند ہو وہی اختیار کی جائے۔

۵۹۔ مسلمانوں میں صحیح نصب العین نہ ہونے کے نتائج

اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بہ حیثیت قوم کے مسلمانوں کی سیاسی پالیسی میں یکسانیت نہ ہونے سے وہ حکام سلطنت اور برادران وطن دونوں کے درمیان مثل فٹ بال کے بنے ہوئے ہیں اور منجملہ دیگر وجوہ کے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ روز بروز قعر مذلت میں گرتے چلے جاتے ہیں۔ گزشتہ واقعات سے یہ ظاہر ہو گیا کہ کتنے اولوالعزم اور وسیع الخیال انگریز عہدہ دار ہندوستان کی اقتصادی آزادی کے لئے ہمہ تن ساعی رہے مگر ہمیشہ ناکام رہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۴۰ء میں جب ولایتی اور ہندوستانی مال پر محصولات کو مساوی کرنے کی سفارش کی تو وہ نامنظور ہوئی۔ ۱۸۵۹ء میں لارڈ کیننگ نے محصولات کے بارہ میں قانون جاری کیا تو وہ خارج کر دیا گیا۔ انہیں لارڈ کیننگ نے جب غدر کے بعد ہندوستانیوں پر رحم کھا کر دیہات میں آگ لگانے اور کشت و خون کرنے کی ممانعت کی تو اُن کا نام حقارت کے طور پر "کمزور کیننگ" رکھ دیا گیا۔ ۱۸۶۰ء میں سر چارلس ٹریویلین نے مزید محصولات کی مخالفت کی تو انہیں گورنری سے علیحدہ کر دیا گیا۔ لارڈ نارتھ بروک کی مرضی کے خلاف جب ۱۸۷۶ء میں افغانستان پر

حملہ کا حکم ہوا تو ہندوستان کی زیر باری کا خیال کر کے وائسرائے موصوف اپنے عہدہ سے استعفٰے دیکر چلے گئے۔ ان حالات میں مسلمانوں کا جو اقلیت میں ہیں مقامی حکام کے وعدہ وعید پر بھروسہ کرنا "جو خویشتن گم است کرا رہبری کند" کے مصداق ہیں۔ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔

بدقسمتی سے ایک طرف تو بعض مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک میں اُن کی ہستی صرف انگریزوں کی وجہ سے باقی ہے۔ اس لیے ہر امر میں اُن کے اشارہ پر چلنے کو قومی خدمت سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف ہماری قوم کے بعض اصحاب مدتوں اس خیال میں رہے ہیں کہ برادران وطن کی امداد سے جزیرۃ العرب کو انگریزوں کے اثر سے پاک کرائیں اور اس کے لیے اُن کی ہمدردی حاصل کرنا ہر امر پر مقدم سمجھتے ہیں اور ہر ممکن کوشش سے اُن کو رضامند رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اُن کی دوستی کو قوم کے لیے امرت سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ دونوں فریق اپنی اپنی جگہ درست ہوں مگر واقعہ یہ ہے کہ ان مسائل کا ہندوستان میں مسلمانوں کے قیام و بقا سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ چند سال ہوئے کہ مسلمانوں کو اس ملک سے ناراض ہو کر ہجرت کر کے افغانستان کو چلے جانے اور اُس تجربہ کے بعد اب کافی تجربہ ہو چکا۔ اب بھی مسلمانوں کو سمجھنا چاہیے کہ سات کروڑ انسانوں کی آئندہ نسلوں کی بہبودی اور حفاظت اسی میں ہے کہ ہر مسئلہ کو اس نظر سے دیکھیں کہ اس کا اثر اُس ملک کی فلاح و بہبود پر کیا پڑیگا۔ جس میں اُن کی اولاد کو بسنا اور رہنا ہے۔ گذشتہ چند سالوں میں "روپی ریشیو" اور دوسرے

اقتصادی مسائل میں بعض مسلمانوں نے اسمبلی اور کونسلوں میں وہ طرزِ عمل اختیار کیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اس ملک سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ مسلمانوں کا یہ انتشارِ خیال اور یہ طرزِ عمل اُن کی قوم کے لیے اس قدر مضر اور مہلک ہے کہ اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کے کمزور نصب العین سے افرادِ قوم میں پست ہمتی اور بزدلی پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ بعض اصحاب مسلمانوں کے لیے یہ مفید سمجھتے ہیں کہ وہ جسیم شاہد بن کر ہندوستان کی ترازو میں مثل اس وزن کے سمجھے جانے لگیں کہ جس پلہ میں وہ پڑ جائیں اس کو بھاری کر کے اسے جھکا دیں۔ چنانچہ اس اصول پر عملدرآمد کر کے انھوں نے کونسلوں میں بالعموم حکمراں جماعت کا ساتھ دیا جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ اُن کے دلوں میں ہماری اہمیت اور وقعت ہوگی۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے اس طرزِ عمل کی نسبت حکامِ وقت کے جو خیالات قائم ہوئے اور جن کا اظہار اُس یادداشت میں کیا گیا ہے جو صوبۂ متحدہ کی گورنمنٹ کی طرف سے سائمن کمیشن کے سامنے پیش ہونے کے لیے تیار کی گئی ہے وہ قابلِ ملاحظہ ہے۔ یادداشت کے الفاظ یہ ہیں:—

"انتظامی حکومت اور قانون ساز جماعت کے باہمی تعلقات میں کمزوری کے تین عناصر ہیں۔ اُن میں سے ایک مختلف فرقوں کی باہمی بدمزگی ہے جس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ یا تو تمام کام رُک جائے ورنہ مسلمانوں کو اس امر پر مجبور کرے کہ وہ سرکاری جماعت "نامرد ساتھی" بن کر سیاسی نشو ونما کا خاتمہ کر دیں۔"

غرضکہ مسلمانوں کا خود کوئی نصب العین نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ آج باوجود معقول تعداد میں ہونے کے محض گورنمنٹ کا ساتھ دینے کی وجہ سے وہ "نامرد" قرار دیئے جا رہے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد ٹرکی۔ ایران۔ مصر اور افغانستان کی مجموعی آبادی سے کہیں زیادہ ہے۔ مگر اس سات کروڑ جماعت کا مقابلہ اُس اولوالعزم طارق سے کیجئے جس نے اسپین کے کنارے پر پہنچکر اپنے جہازوں کو یہ کہہ کر جلا دیا کہ اب مجھے واپس جانا نہیں بلکہ اسپین کو اپنا گھر بنانا ہے۔ چنانچہ اسی نصب العین کی وجہ سے خداوند تعالیٰ نے طارق میں اُس ملک کو فتح کرنے کی ہمت اور قوت عطا کی اور جب تک کہ جبل الطارق کا وجود قائم ہے طارق کا نام دنیا میں روشن رہے گا۔ ہندوستان کی تین چوتھائی آبادی جس میں متضاد اور مختلف العقیدہ اور آپس میں چھوت چھات رکھنے والی ذاتیں شامل ہیں صرف اس لیے ایک قوم بن رہی ہیں کہ اُن سب نے کلیتاً ہندوستان کو اپنا وطن سمجھ کر اُس کی ترقی کو اپنا نصب العین قرار دے لیا ہے۔ برخلاف اس کے سات کروڑ مسلمان جن کا مذہب تمدن اور معاشرت ایک ہے باہمی اختلافات اور فرقہ بندیوں کے شکار بن رہے ہیں۔ صرف اس لیے کہ اُن کے سامنے کوئی مستقل نصب العین نہیں ہے جو اُنھیں ایک نقطہ پر لاکر مختلف الخیال افراد کو سیاسیات میں متحد الخیال بنا دے۔

خوش قسمتی سے گزشتہ ماہ ستمبر میں ہندوستان کی تمام جماعتوں نے لکھنؤ میں جمع ہو کر اپنا ایک مشترک نصب العین قائم کیا ہے جس نے ایسے خیال کے

انتخاب کو جو ہندوستان کی آزادی اور بہبودی کو رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں پریشانی میں ڈال دیا ہے۔ ہندوستان کے اس مشترک نصب العین میں تمام قلیل التعداد جماعتوں نے بشمول مسلمانوں کے شرکت کی اور خوشی کی ایک لہر ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ گئی۔ اُس کے بعد مسلمانوں کی ایک جماعت کے دلوں میں متفقہ فیصلہ کے متعلق کچھ شکوک پیدا ہو گئے۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آیندہ صفحات میں آل پارٹیز کانفرنس کے فیصلہ پر نظر کی جائے۔

باب ہشتم

خاتمہ

۶۰۔ آل پارٹیز کانفرنس کا فیصلہ (الف) عام حالات۔ ہندوستان کی اگرچہ انگریزی عملداری کی بدولت بیرونی سلطنتوں کے حملوں سے پوری حفاظت ہے مگر نفاق کے ذریعہ اُن پر حکومت ہونے کی وجہ سے مختلف فرقوں میں سخت بدمزگی اور کشمکش رہتی ہے کہ یہاں کے لوگ ذرا سا اشتعال ہونے پر ایک دوسرے کے نہتے اور کمسن بچوں اور عورتوں کو ہلاک

کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے اس باہمی کشمکش اور بے اطمینانی کی زندگی سے ہندوستان کی تمام جماعتیں نالاں ہیں اور وہ ہمیشہ اس امر کی متمنی اور خواہشمند رہتی ہیں کہ ایک دوسرے سے مل کر اتفاق اور اتحاد کے ساتھ رہیں۔ چنانچہ کبھی کبھی صلح اور آشتی کا دور بھی آتا رہتا ہے مگر ملک کا نظام کچھ اس قسم کا واقع ہوا ہے کہ مذہبی فرقہ بندیوں کی بنا پر پھر علیحدگی ہو کر پہلے سے بھی بدتر حالت ہو جاتی ہے۔ البتہ جنگ عظیم کے بعد جب حکومت کی طرف سے خلاف توقع برتاؤ ہوا تو ترک موالات کے سلسلہ میں ہندو مسلمانوں میں حد درجہ میل ہو گیا۔ اور وہ کئی سال تک قائم رہا۔ مگر بالآخر وہ اتحاد واتفاق پھر ٹوٹا اور اس دفعہ باہمی تنازعات اور فسادات پہلے سے کہیں زیادہ وسیع پیمانہ پر ہوئے۔ ذیل کے اعداد سے معلوم ہوگا کہ صرف صوبہ متحدہ میں مذہبی بلووں کی تعداد سال بسال کس طرح بڑھتی چلی گئی۔

۱۹۲۲ء	۱۹۲۳ء	۱۹۲۴ء	۱۹۲۵ء	۱۹۲۶ء	۱۹۲۷ء
۲	۲۶	۱۸	۱۲	۱۵	۲۷

ان حالات سے تنگ آکر مختلف فرقوں نے باہمی سمجھوتہ کی کوششیں کیں مگر رنجشیں اس قدر بڑھی ہوئی تھیں کہ کبھی کوئی مختتم اور متفق الیہ فیصلہ نہ ہو سکا ان رنجشوں کی شدت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے گورنمنٹ نے اول ملک ہندوستان کو ٹٹولا اور باہمی مصالحت کرانے کا پیام دیا۔ جب اس کا کوئی اثر نہ ہوا تو اس ناگوار حالت سے فائدہ اوٹھا کر گورنمنٹ نے کمیشن اصلاحات کے تقرر کا اعلان کیا جس میں سب کے سب ممبر انگریز تھے اور

کوئی ہندوستانی نہ تھا۔ اس پر ہندوستانیوں نے شور و شغب کیا۔ مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ اس توہین نے ہندوستانیوں کو متحد کر دیا اور اونھوں نے شاہی کمیشن سے ترک موالات کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس پر لارڈ برکن ہیڈ نے ہندوستانیوں کو چیلنج دیا کہ وہ خود نظام ہند کا ایک مسودہ تیار کریں تو اُس پر غور کیا جائے گا مگر اُسی کے ساتھ یہ خیال بھی ظاہر کر دیا کہ ہندوستانی متفق ہو کر کوئی نظام پیش نہ کر سکیں گے۔ وزیر ہند کے اس اظہار خیال نے اہل ہند کی متضاد جماعتوں کو متحد کر دیا اور جب پنڈت موتی لال کی کمیٹی کی تیار کردہ رپورٹ ستمبر کے آخر میں پیش ہوئی تو لکھنؤ نے مختلف الخیال اور مختلف العقائد لوگوں کے اجتماع کا اور باہمی مفاہمت کا وہ منظر پیش کیا جو اہل ہند نے کبھی پہلے نہ دیکھا تھا۔ ہر صوبہ کی متضاد اور مخالف پارٹیاں ایک دوسرے کے خلاف اکھاڑے میں اُترنے کے لیے آئی تھیں مگر ہندوستان کی خوش نصیبی سے ٹھنڈی ہو کر باہمی سمجھوتہ پر راضی ہو گئیں۔

(ب)۔ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نمایندگی :-

سب سے بڑے اختلافات پنجاب اور سندھ کی مختلف پارٹیوں میں تھے۔ پنجاب کے مسلمانوں کے دو گروہ تھے۔ ایک گروہ مُصر تھا کہ مخلوط انتخاب کے ساتھ نشستیں معین کر دی جائیں۔ دوسرا گروہ اس کو مسلمانوں کے لیے مضر سمجھتا تھا۔ اور حساب کی رو سے یہ ثابت کرتا تھا کہ بعض اضلاع میں چونکہ مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اس لیے آبادی کی نسبت سے نشستیں معین ہوں

ہیں اُنھیں نقصان رہے گا۔ موجودہ حالت میں کمی دولت کی وجہ سے مسلمان ووٹروں کی تعداد کم ہے اور بمقابلہ ۵۵ فی صدی مردم شماری کے اس وقت مسلمان صرف ۴۲ فی صدی ووٹر ہیں تاہم حال کے لوکل بورڈوں کے انتخابات میں مسلمان منتخب شدہ ممبروں کی تعداد ہندوؤں سے زیادہ رہی۔ نہرو رپورٹ کی رو سے آیندہ کے لیے یا تو ہر بالغ کو ووٹ دینے کا حق ہوگا۔ ورنہ جو صورت بھی اختیار کی جائے گی اُس میں ووٹروں کی تعداد ہر فرقہ کی مردم شماری سے کسی طرح کم نہ رکھی جائے گی۔ ایسی حالت میں اس گروہ کو ہر طرح امید تھی کہ نشستیں غیر معین رہنے میں مسلمانوں کو بہت نفع رہے گا۔

پنجاب میں سکھوں کی قوم اقلیت میں ہے اور اُن کی مردم شماری صرف گیارہ فی صدی ہے۔ اُن کے ایک گروہ نے یہ دیکھکر کہ بعض مسلمان باوجود اکثریت میں ہونے کے نشستوں کے تعین کا مطالبہ کرتے ہیں تخصیص نشست کا مطالبہ کیا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ جب اُنھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی دونوں متضاد پارٹیاں اس بات کو مان گئیں کہ پنجاب میں نشستیں غیر معین رہیں تو سکھوں کے اُس گروہ نے بھی اپنے مطالبہ سے دستکشی اختیار کرلی اور پنجاب کی تمام جماعتوں کا متفقہ فیصلہ داخل ہوگیا۔

بنگال میں مسلمانوں کی مردم شماری اگرچہ ۵۴ فی صدی ہے مگر وہاں چونکہ مسلمانوں کی مالی حالت زیادہ کمزور ہے اس لیے یہ خیال تھا کہ وہ بھی اپنی نشستیں معین کرائیں گے مگر حال کے لوکل بورڈوں کے انتخابات میں اُنھیں بھی تجربہ ہوا تھا کہ اُن منتخب شدہ ممبروں کی تعداد اُن کی

آبادی کی نسبت سے زیادہ رہی اس لیے وہاں کی متضاد جماعتیں تعین نشست
کے مطالبے سے دست بردار ہو گئیں۔

(ج) صوبہ سندھ کی علیحدگی۔

صوبہ سندھ میں مسلمانوں کی آبادی ۷۰ فی صدی ہے۔ اس لیے
وہاں کے مسلمانوں کی حالت انتخابات میں محفوظ تھی۔ البتہ صوبہ سندھ
کو علیحدہ کرنے میں ہندوؤں کی ایک جماعت کو اختلاف تھا۔ ہندوؤں
کی اس جماعت کے مقابلہ میں جو سندھ کی علیحدگی کی مخالف تھی۔
ہندوؤں کی دوسری جماعت تیار ہو کر آئی تھی۔ اور اس طرح ہندوؤں کی
دونوں متضاد جماعتیں اپنے اپنے دعووں کے ثبوت میں کتابیں، رسالے
اور اعلانات چھپوا کر ساتھ لائیں تھیں۔ مگر آل پارٹیز کانفرنس کی پُر امن
ہوا میں داخل ہوتے ہی سب کے حواس درست ہو گئے۔ اور سب نے
مل کر یہ سمجھوتہ کیا کہ:۔

"سندھ بمبئی سے علیحدہ کر کے اُس کا ایک جداگانہ صوبہ
بنایا جائے بشرطیکہ:

(الف) تحقیقات سے معلوم ہو کہ سندھ خود اپنا
صرفہ برداشت کرنے کے قابل ہے۔

(ب) اُس صورت میں جبکہ معلوم ہو کہ وہ اپنا صرفہ
برداشت نہیں کر سکتا تو باشندگان سندھ کے

سامنے سندھ کی علیحدگی کی اسکیم معہ اس کے اقتصادی
اور انتظامی حالات کے رکھی جائے اور باشندگان
کی زیادہ تعداد اس اسکیم کو پسند کرے اور خرچہ کی
ذمہ داری کو برداشت کرنے پر آمادگی ظاہر کرے۔"

اس سمجھوتہ پر ہندوؤں کی دونوں جماعتیں اور مسلمانوں کے نمائندے راضی ہو گئے اور سب نے متفقہ فیصلہ پر دستخط کر دیے۔ اس پر بعض اصحاب کا اعتراض ہے کہ صوبۂ سندھ کی علیحدگی کا مسئلہ لاینحل رہا مگر جب کہ آخری فیصلہ کا انحصار کثرت رائے پر ہے اور مسلمان رائے دہندے ۷۰ فی صدی ہیں تو یہ امر سمجھ سے باہر ہے کہ اس میں مسلمانوں کی حق تلفی کس طرح ہوئی۔ ؟

(۱۵) صوبۂ سرحدی اور بلوچستان میں اصلاحات

اب تک صوبۂ سرحدی اور بلوچستان میں اصلاحات کا نفاذ نہیں کیا گیا ہے اور وہاں کونسلیں قائم نہیں ہوئیں۔ اس جلسہ میں یہ طے ہوا کہ ان صوبجات کو بھی اصلاحات دی جائیں اور بلوچستان کو صوبۂ سرحدی میں شامل کر دیا جائے۔ ان دونوں صوبوں میں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت ہے۔ موجودہ حالت میں کوئی صوبہ ایسا نہیں کہ اس کی کونسل میں مسلمان ممبروں کی اکثریت ہو مگر اس کانفرنس کے سمجھوتہ کی رو سے چار صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گئی۔

(۸) معین نشستوں کے ساتھ مخلوط انتخاب

اب رہا جداگانہ انتخاب۔ اس کی نسبت تو پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ یہی تو مختلف جماعتوں میں باعث فساد ہے اور بالخصوص اقلیتوں کے لیے سم قاتل ہے۔ حکومت خود اختیاری ملنے کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ ملک میں مخلوط انتخاب جاری ہو اور جو اصحاب جداگانہ انتخاب کے شدت کے ساتھ حامی ہیں اُنھیں بھی یہ امر تسلیم ہے کہ جداگانہ انتخاب ایک عارضی شے ہے۔ اور کسی نہ کسی دن جا کر رہے گا۔ پس جب کہ اُس کا وجود مُضر ہونے کے ساتھ ملک کو مزید اصلاحات ملنے میں مانع ہے تو جس قدر جلد اُس سے پیچھا چھوٹے بہتر ہے۔

ایک اور امر غور طلب یہ ہے کہ ہندوستان میں صرف مسلمان ہی اقلیت میں نہیں بلکہ دوسری قوموں کی بھی یہی بلکہ ان سے کہیں زیادہ بدتر حالت ہے۔ ذیل کے نقشہ سے اس کی تفصیل معلوم ہوگی۔

کل ہندوستان میں

ہندو۔ ... ... ۶۵ر۹ فیصدی

مسلمان۔ ... ... ۲۴ر۱ ،،

بودھ۔ ... ... ۳ر۶ ،،

جرگے (پہاڑی)۔ ۳ر۸

عیسائی	...	...	...	...	۱ء۲ فیصدی
سکھ	...	...	...	...	۱ء۰
جینی	...	...	...	...	۲ء
دیگر	...	...	...	...	۲ء

مسلمانوں کی مردم شماری بعض صوبجات میں

بلوچستان	...	...	...	۹۱ء۷ فیصدی	
صوبہ سرحدی	...	...	...	۹۰ء۷	”
سندھ	...	...	...	۷۳ء۰	”
پنجاب	...	...	...	۵۵ء۳	”
بنگال	...	...	...	۵۴ء	”

مندرجۂ بالا نقشہ جات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض صوبوں میں مسلمان بہت بڑی اکثریت میں ہیں۔ اور کل ہندوستان میں ان کی تعداد ایک چوتھائی کے قریب ہے۔

ہمنے مندرجۂ بالا سطور میں اُن صوبوں کا تذکرہ کیا ہے جن میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ اب رہے وہ صوبے جن میں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ اُن میں سے ایک صوبہ صوبہ متحدہ ہے۔ یہاں مسلمان پندرہ فی صدی ہیں مگر سنہ ۱۹۱۶ء کے معاہدہ لکھنؤ کی رو سے یہاں ۳۰ فی صدی نشستیں کونسلوں میں مسلمانوں کو ملی تھیں۔ لیکن اُس وقت پنجاب اور بنگال کو اقلیت

ہیں کر کے ان صوبجات میں مسلمانوں کی نسبت بڑھا دی گئی تھی جس کی وجہ
سے مسلمان ہندوستان کے تمام صوبجات میں اقلیت میں ہو گئے تھے
اس سے پنجاب اور بنگال ٹوٹے میں رہے تھے اور صوبہ متحدہ اور
دوسرے اقلیت والے صوبوں کو بھی کوئی بدیہی نفع نہ پہنچا تھا کیونکہ دونوں
صورتوں میں وہ اقلیت میں تھے۔ اب جب کہ پنجاب اور بنگال صوبہ
سرحدی۔ سندھ اور بلوچستان میں مسلمانوں کو اکثریت مل گئی ہے تو کوئی
وجہ نہیں کہ مسلمانوں کی وہی ۳۰ فی صدی کی نسبت صوبہ متحدہ میں قائم
رہے۔ البتہ اُسی کے ساتھ ایک حق اقلیتوں کو یہ مل گیا ہے کہ معین نشستوں
کے علاوہ وہ اپنی کوشش سے مزید نشستیں لے سکتے ہیں۔ مثلاً صوبہ متحدہ کی
پندرہ معین نشستوں کے علاوہ اُن کے مقابلہ میں بودھ اور عیسائی، سکھ
جینی اور پارسی اس قدر زیادہ اقلیت میں ہیں کہ اُن کا وجود بمنزلہ نفی کے
ہے۔ مگر حیرت انگیز امر یہ ہے کہ مسلمانوں پر اپنی اقلیت کا خوف اس قدر
غالب ہے کہ وہ اُن صوبوں میں بھی برادران وطن سے ترساں و لرزاں
رہتے ہیں۔ جہاں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ چنانچہ پنجاب کے بعض
رہنماؤں نے سائمن کمیشن کے سامنے جداگانہ نیابت کا مطالبہ کیا اور افسوس
کہ وہاں اُن کا مضحکہ ہوا اور مضحکہ سے کہیں زیادہ افسوسناک امر یہ ہے
کہ بے موقع اپنی کمزوریوں کا گیت گائے جانے سے قوم پر پست ہمتی اور
بزدلی طاری ہو رہی ہے اور چونکہ اس قسم کے مطالبات سے اصلاحات
کے ملنے میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے مسلمانوں کی قوم کے

ماتھے پر ہمیشہ کے لیئے کلنگ کا ٹیکہ لگتا ہے۔ کہ وہ ملک کی ترقی میں حارج ہوتی ہیں۔ حیرت ہے کہ پارسی اور عیسائی تو صاف الفاظ میں کہدیں کہ انھیں جداگانہ نیابت کی ضرورت ہے اور نہ ملازمتوں میں تعین کی مگر مسلمان جو بدیہی طور پر اس عملداری میں مسلسل گرتے چلے آئے ہیں وہ انھیں کی پناہ لینا چاہتے ہیں جنھوں نے انھیں اس حال پر پہونچا دیا۔ یہ وہی مسلمان تو ہیں جو غدر اور اس کے مابعد کے زمانہ تک بعض عہدوں پر سو فی صدی تھے، اور پنجاب کے سررشتہ تعلیم کا میدان اُن کے ہاتھوں میں تھا وہ کس کی بدولت ملازمتوں سے خارج ہوئے اور اب تھوڑے بہت جو بعض محکموں کے کونوں میں پڑے ہیں وہاں سے کیوں خارج ہونے والے ہیں۔ وہ اس طرح کہ حکام گورنمنٹ ایک طرف تو دوسری قوموں کے لوگوں کو بڑھاتے جاتے ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں کی اہمیت کو تسلیم کر کے انھیں آمادہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی تعداد سے زیادہ ملازمتوں کا مطالبہ کریں۔ جب مسلمان اپنی مسلمہ اہمیت اور اعداد و شمار کی بنا پر گورنمنٹ سے اپنی ملازمتوں کی تعداد کے اضافہ کی استدعا کرتے ہیں تو جن شعبوں میں مسلمان زیادہ ہیں انھیں برادرانِ وطن روشنی میں لاکر طشت از بام کرتے ہیں۔ اور کوشش کرتے ہیں کہ وہاں سے بھی مسلمانوں کو خارج کریں اور گورنمنٹ کی حالت یہ ہے کہ اس بارہ میں نہ کبھی اُس نے مسلمانوں کی امداد کی اور نہ اُمید ہے کہ آیندہ کرے۔

(و) اہم المسائل۔

اسی سلسلہ میں ہمیں آل پارٹیز کانفرنس کے دیگر منصوبوں کی نسبت کچھ عرض کرنا ہے ۔ مگر اُسی کے ساتھ یہ ظاہر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر اندیشہ ایک مذہب والوں کو دوسرے مذہب والوں سے ہیں وہ اُسی وقت تک ہیں ۔ جب تک کہ ملک میں مذہبی بنا پر پارٹیاں بنی ہوئی ہیں ۔ اور مذہبی پارٹیاں اُس وقت تک ہیں جب تک کہ جداگانہ نیابت ہے جس وقت جداگانہ نیابت اُٹھ جائے گی اُمید ہے کہ اُسی وقت ملک میں سیاسی پارٹیاں بن جائیں گی اور اُس وقت مذہب وملت کا لحاظ نہ ہوگا بلکہ ایک طرف زمیندار ہوں گے تو دوسری طرف کاشتکار، ایک طرف کارخانہ دار ہوں گے تو دوسری طرف کاریگر۔ ایک طرف سرمایہ دار ہوں گے تو دوسری طرف مفلس اور نادار وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ وقت ہوگا جب کہ ہمارے بہت سے باہمی سمجھوتے اور فیصلے جن پر ملک کے رہنماؤں کا بڑا وقت ضائع جاتا ہے ۔ مثل دفتر پارینہ کے ردیوں میں پڑی ہوں گے اور اُن کے مطالعہ سے ہماری آیندہ نسلیں ہم پر ہنسا کریں گی مگر جب تک کہ حالات میں تبدیلی نہ ہو ہم اُن امور کو نظر انداز نہیں کر سکتے اس لیئے اختصار کے ساتھ ہم اُن پر نظر ڈالتے ہیں ۔

(ز) ¾ کی کثرت سے تجاویز کے مسترد کیئے جانیکا حق

ہندو مسلمانوں کے اس سمجھوتے میں جو ۱۹۱۶ء میں بمقام لکھنؤ مکمل

ہوا تھا یہ طے پایا کہ "کوئی مسودہ قانون یا اُس کا کوئی فقرہ اور کوئی رزولیوشن جس کی تحریک کسی غیر سرکاری ممبر نے کی ہو اور جو کسی خاص قوم کے حقوق پر اثر ڈالتا ہو کسی مجلس وضع قوانین و آئین کے سامنے پیش نہ کیا جا سکے گا جبتک کہ اس قوم یا فرقے کے جس پر وہ مسئلہ موثر ہوتا ہو ۳/۴ ممبر اس کے پیش ہونے سے اتفاق نہ کریں"۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ قاعدہ کسی خاص قوم سے متعلق نہ تھا بلکہ تمام فرقوں اور جماعتوں پر بلالحاظ اس کے کہ وہ کثرت میں ہیں یا قلت ہیں اُس پر اثر ڈالتا تھا جب کہ یہ مسئلہ مسٹر مانٹیگو اور لارڈ چیمسفورڈ کے سامنے پیش ہوا تو انھوں نے اس کی پوری چھان بین کی اور مندرجۂ ذیل ریمارک کے ساتھ اس کو نامنظور کر دیا۔ "یہ فقرہ اس قدر وسیع الفاظ میں لکھا گیا ہے کہ عملی صورت حاصل ہونے پر اس کی اس قدر توجیہات کی جائیں گی کہ اس پر عمل ہونا ناممکن ہو جائے گا۔ ہر قانون لازمی طور پر ہندو اور مسلمان دونوں پر موثر ہوتا ہے۔ اس فقرہ کی لفظی توجیہہ سے یہ نوبت پہنچے گی کہ عام نوعیت کے قانون کے لیے بھی ہر قوم یہ چاہے گی کہ اس کی کثرت رائے سے اس کو پاس کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اس سمجھوتے کے منظور کرنے سے یہ غرض تھی کہ ہندو و مسلمانوں کے مخصوص مذہبی حقوق و مراسم کی حفاظت کی جائے۔ لیکن جہاں تک قانون کے ذریعہ سے ایسی عام حفاظت ہو سکتی ہے وہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۵ء کی دفعہ ۹ میں موجود ہے۔ جس کی رو سے یہ لازم ہے کہ تمام قوانین جو مذاہب یا مذہبی مراسم اور کسی قوم کے خاص رواجات پر اثر ڈالتے ہوں ان کے پیش کیے جانے سے قبل گورنر جنرل کی

منظوری حاصل کرنا ضروری ہوگی۔"   (ماٹیگو رپورٹ صفحہ ۱۰۲)

گورنمنٹ آف انڈیا کا یہ جواب اس وقت مختتم سمجھا گیا تھا اور اس سمجھوتے کے متعلق اس کے بعد کوئی بحث نہیں کی گئی - اب آل پارٹیز کے جلسہ میں اس کو دوسری مرتبہ زیر بحث لایا گیا اس جلسے نے بھی یہی طے کیا کہ وہ ناممکن العمل ہے - اس سمجھوتے کے قانونی صورت میں آ جانے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ چھوٹی سے چھوٹی اقلیت کے ہاتھ میں ایک ایسا آلہ آ جائے گا کہ جس کو وہ کونسلوں کے مفید کام میں رکاوٹ ڈالنے میں استعمال کر سکیں گے مثلاً ہندوستان کے رہنے والے اینگلو انڈین اصحاب کا ایک نمائندہ جو کونسل یا اسمبلی میں تنہا ہو یہ کہے کہ فلاں مسئلہ (جو فی الواقع ملک کی اقتصادی ترقی کے لیے ضروری ہے) اینگلو انڈین جماعت کے لیے مضر ہے تو وہ مسئلہ بحث سے خارج کر دیا جائے گا - گویا اس دفعہ کے نفاذ سے ہر اقلیت اپنے قلیل نفع کے لیئے کل ملک کو نقصان پہنچا سکے گی - اور اسی طرح سے جن صوبوں میں غیر مسلم اقلیت میں ہیں وہ وہاں مسلمانوں کی ترقی میں مزاحمت پیدا کر سکتے ہیں - دراصل اگر کسی حق کی حفاظت کی واقعی ضرورت ہے تو وہ مذہبی حقوق اور نہرو رپورٹ میں بنیادی حقوق کے تحت میں مکمل طور پر محفوظ کر دیے گئے ہیں جن میں کسی طرح کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی - ان وجوہ سے خود مسلمانوں نے آل پارٹیز کانفرنس کے جلسہ میں تین چوتھائی کے قاعدہ کو غیر ضروری قرار دیا -

---

(ح) عورتوں کو ووٹ دینے کا حق

بعض اصحاب کو یہ اعتراض ہے کہ مسلمان عورتیں بوجہ پردہ ووٹ
دینے کو کم جائیں گی جس سے مسلمانوں کو نقصان رہے گا۔ اس کی نسبت
عرض ہے کہ اول تو دیہات میں ہر قوم کی عورتیں یکساں باہر پھرتی ہیں
دوسرے یہ کہ شہروں میں ہندو شرفا کی عورتیں بھی کم و بیش پردہ کرتی
ہیں اور ووٹ دینے کے لیئے جانے کے اعتبار سے مسلمانوں اور ہندوؤں
کی عورتوں کے پردہ کے اثرات میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اس کے
علاوہ آج کل بھی عورتوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔ مگر ہندو
شرفا میں سے کتنی عورتیں ووٹ دینے جاتی ہیں۔ اسی طرح انگلستان
اور امریکہ میں بھی باوجود بے پردگی کے بہت کم عورتیں ووٹ دینے
جاتی ہیں اور جو جاتی ہیں وہ بالعموم اپنے شوہروں یا رشتہ داروں کے
ساتھ ووٹ دیتی ہیں۔ البتہ ایک خاص امر یہ ہے کہ اخلاقی مسائل
میں وہ اپنے شوہروں اور عزیزوں کی پرواہ نہیں کرتیں مثلاً امریکہ
میں شراب خواری بند کرنے کی تحریک میں عورتوں کا بڑا حصّہ ہے۔
اس حساب سے امید ہے کہ یہاں بھی عورتوں کے ووٹ میں شریک
ہونے سے مردوں کی بہت سی بداعمالیوں میں کمی آئے گی۔ اب
رہی ہندوستان کی عورتوں میں پردہ کی پابندی اُسے قائم رکھکر
بھی ووٹ دینے کا انتظام ہو سکتا ہے۔ اب بھی تو محفل میلاد شریف

ہیں اور مذہبی اور سیاسی جلسوں میں عورتوں کے پردہ کا انتظام ہوتا ہے
اِسی طرح ووٹ دینے کے لیے بھی پردہ کا خاص انتظام کیا جا سکتا ہے۔
مگر سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ اب جب کہ عورتوں کے حقوق میں اضافہ
ہونے کا زمانہ آ رہا ہے کون سی وہ قوت ہے جو اُن کے موجودہ حق ووٹ
کو اُن سے چھین سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اُس وقت مسلمانوں کی خاطر
عورتوں سے یہ حق چھین لیا جائے تو عجب نہیں کہ خود مسلمانوں کے
گھروں میں جوتی پیزار ہونے لگے اور اُس سے وہ سماں سامنے آ جائے
جو مدتوں انگلستان میں عورتوں اور مردوں کی کشمکش میں رہا ہے جب کہ
وہاں عورتیں ووٹ کا حق حاصل کرنے کے لیئے اکھاڑے میں اُتری ہوئی
تھیں۔ کانپور کی گذشتہ آل مسلم پارٹیز کانفرنس میں جب کامل آزادی
کے مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی تو سنا گیا ہے کہ عورتوں نے پردہ میں سے
لکھ بھیجا تھا کہ مرد کوتاہی کریں گے تو عورتیں اُسے پاس کرانے کے لیے پردہ
میں سے نکل آئیں گی۔ غرض کہ عورتوں کے حاصل شدہ حق کو چھین لینا
کوئی آسان کام نہیں ہے۔

(ط) زبان کا مسئلہ۔

زبان کے مسئلہ کی نسبت ناظرین نے اس کتاب کے فقرہ ۳۴ میں
ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ اُسے رجعت پسند حکام نے اپنی اغراض کے لیے اُٹھایا
تھا۔ خود یورپ میں ایسے ملک موجود ہیں جن کے باشندے متعدد قسم کے

حروف میں لکھتے پڑھتے ہیں۔ اور اُن سب کو عدالتوں نے جائز قرار دیدیا ہے
مثلاً سوئزرلینڈ کے رقبہ کے مقابلہ میں ہندوستان کا رقبہ ۰ اگونہ ہے۔
اور وہاں کی آبادی کے مقابلہ میں یہاں کی آبادی ۰ ۸ گنی ہے۔ باوجود اس
کے وہاں چار زبانیں عدالتی زبانیں قرار دی گئی ہیں۔ وہاں کے لوگوں کو
اختیار حاصل ہے کہ فرانسیسی۔ جرمن۔ اٹیلین اور روس میں سے جس زبان
میں چاہیں عدالتوں میں کارروائی کریں۔ کونسلوں میں تقریریں کریں اور
گورنمنٹ جب اعلانات جاری کرتی ہے۔ تو ان تمام زبانوں میں اُنھیں
شائع کرتی ہے۔ اگر اُس ملک کے رہنے والوں سے کہا جائے کہ اُن سے
ننانوے گنے وسیع ملک میں صرف اردو اور ہندی حروف کا جھگڑا رہتا ہے
تو اُسے وہ محض ایک افسانہ سمجھیں گے۔ غرضکہ اس ملک میں زبان کا
مسئلہ تو ذرا بھی اہمیت نہیں رکھتا اور اُسے آل پارٹیز کانفرنس نے بالاتفاق
اس طرح طے کر دیا گیا ہے کہ ملک کی زبان کو عربی حروف اور ناگری حروف
میں لکھنا جائز قرار دیا جائے۔

(ی) اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی۔

موجودہ نظام میں جب کہ مسلمان ہندوستان کے تمام صوبوں میں
اقلیت میں ہیں، اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی ایک ثلث ہے۔ مگر آل پارٹیز
کانفرنس کے فیصلہ کی رو سے جب کہ مسلمانوں کو چار صوبوں میں اکثریت
حاصل ہو جاتی ہے تو اسمبلی میں مسلمانوں کی نمایندگی اُن کی تعداد کی نسبت

سے رکھی گئی ہے جو ایک ربع اور ایک ثلث یعنی ۲۵ اور ۳۳ فی صدی کے درمیان ہوگی مگر اسمبلی میں مسلمان ۲۵ فی صدی ہوں یا ۳۳ فی صدی وہ ہر صورت میں اقلیت میں رہیں گے اور اُن کی اقلیت اکثریت میں نہیں بدل سکتی اور اس پر واجبی طور پر کوئی اصرار نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اصرار کی وجہ سے دوسری قوم کے لوگ مان بھی جائیں تو زیادہ نفع نہیں ہو سکتا۔ البتہ اگر اس بنیاد پر غیر مسلموں سے سمجھوتہ نہ ہو سکے اور اس کی وجہ سے تمام قرارداد درہم برہم ہو جائے تو اُس میں نہ صرف یہ کہ مسلمانوں پر ناواجبیت کا الزام عائد ہوگا۔ بلکہ مسلمان ملک کی ترقی میں مزاحم ہو کر اپنی آیندہ نسلوں کو اس قدر سخت نقصان پہنچائیں گے جس کی تلافی نہ ہو سکے گی۔

(ک) فیڈرل گورنمنٹ۔

بعض اصحاب کی طرف سے یہ بھی اصرار ہے کہ مرکزی حکومت کو زیادہ قوت دینے سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا۔ اس لیے صوبوں کا نظم مثل دیسی ریاستوں کے نظام کے ہو اور اس طریقہ سے صوبوں کی قوت زیادہ ہو۔ اس کی نسبت یہ عرض ہے کہ انگریزی سلطنت کے جہاں بہت سے عیوب بیان کیے گئے ہیں وہاں ایک سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اُس نے مرکزی قوت کو مضبوط کر کے تمام ہندوستان کو ایک زبردست ملک بنا دیا ہے۔ اور یہ بات ہندوستان کو کبھی حاصل نہ ہوئی تھی۔ پہلے ہندوستان مختلف

صوبوں میں تقسیم تھا اور اُن پر یکسانیت کے ساتھ مستقل طور پر کوئی سلطنت مسلط نہ رہی تھی۔ اس لیے جب مرکزی حکومت کی باگ ڈھیلی پڑتی تھی تو صوبے خودمختار ہو جاتے تھے۔ بیشک صوبوں کی آزادی ایک حد تک مفید چیز تھی مگر خودمختاری کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہندوستان بیرونی سلطنتوں کا آسانی سے شکار ہو جاتا تھا۔ ایک خاص نقص اس ملک میں یہ ہے کہ مختلف صوبوں کے درمیان قدرتی حدود مثل پہاڑوں وغیرہ کے قائم نہیں ہیں جو انہیں جدا گانہ ممالک میں مستقل طور پر تقسیم کر سکیں اور وہ سب علیحدہ علیحدہ اپنی حفاظت کر سکیں۔ ہندوستان کی حالت امریکہ سے بہت کچھ مشابہ ہے اور اس لیے وہاں کی مانند ہندوستان میں بھی خانہ جنگیوں کا زیادہ اندیشہ ہے۔ امریکہ کے لوگوں کا اگرچہ نصب العین، مساوات ہے۔ تاہم وہاں فیڈرل گورنمنٹ قائم ہونے کے پچہتر سال بعد ۱۸۶۰ء میں سخت خانہ جنگی ہوئی جس نے تمام ملک کو برباد کر دیا۔ مگر دیگر وجوہ سے امریکہ بیرونی حملوں سے بچا رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ کے تین طرف سمندر اور ایک طرف پہاڑ ہے اور آس پاس کوئی زبردست سلطنت نہیں ہے جو ہر وقت گھات میں لگی بیٹھی ہو۔ برخلاف امریکہ کے ہندوستان میں تو تین طرف سے حملہ کا ہر وقت اندیشہ لگا رہتا ہے۔ یہاں مرکزی حکومت کی باگ ذرا بھی ڈھیلی ہو گی تو تمام ترقی کے منصوبوں کا خاتمہ ہو جائیگا۔ مسلمانوں کو محض اپنی اقلیت کے وہم سے ایسی مضر تجاویز پیش کرنے سے احتراز کرنا چاہیئے جو اپنے ساتھ تمام ملک کو

لے ڈوبیں۔ اور اس امر کو غنیمت سمجھنا چاہیئے کہ انگریزوں نے ایک زبردست مرکزی قوت قائم کر کے ہندوستان کو رقبہ اور آبادی اور نظام حکومت کے اعتبار سے دنیا میں اول درجہ کا ملک بنا دیا ہے جس کی مردم شماری تمام دنیا کا پانچواں حصّہ اور رقبہ تیسواں حصّہ ہے۔ اب صرف اتنی کسر باقی ہے کہ سلطنت برطانیہ اس وسیع رقبہ کو نوآبادیوں کا درجہ عطا کر دے اور اُس سے ملک کی اقتصادی حالت درست ہو جائے تو دنیا میں اس کا کوئی مقابلہ نہ کر سکے گا۔

(ل) کامل آزادی یا حکومت خود اختیاری۔

مگر سب سے زیادہ دلچسپ مطالبہ جو ایک جماعت کی طرف سے کیا جا رہا ہے وہ کامل آزادی کا مطالبہ ہے یہ مطالبہ کرنے والی جو جماعت ہے اُس میں زیادہ تر برادران وطن شامل ہیں۔ اُن کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ اس بحث میں نصب العین اور مطالبہ کو دو جداگانہ امور قرار دینا چاہیئے اور اس میں خلط مبحث نہ کرنا چاہیئے۔ ہر شخص کا نصب العین اعلیٰ سے اعلیٰ ہو سکتا ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ جو نصب العین ہو وہی ہر منزل میں اُس کا مطالبہ بھی ہو۔ لارڈ کرزن نے اپنی ایک تقریر میں بیان کیا تھا کہ بچپن سے اُن کا نصب العین یہ تھا کہ ہندوستان کے وائسرائے کے عہدہ پر پہنچیں۔ مگر یہ کبھی نہ ہوا کہ اُنھوں نے درمیانی عہدوں کی کبھی خواہش یا کوشش نہ کی ہو۔ یا اُنہیں جب وہ عہدے دیئے گئے ہوں تو اُنھوں نے

اس بنا پر انکار کیا ہو کہ وہ اُن کے نصب العین کے درجہ سے کم ہیں۔
دوسری بات یہ ہے کہ کامل آزادی میں اور حکومت نوآبادیات
میں جو فرق ہے وہ اُس فرق سے زیادہ نہیں ہے جو بی۔ اے ۔ کے
اول ڈویژن اور دوسری ڈویژن میں ہوتا ہے۔ بلکہ اب تو بعض اصحاب
نوآبادیات کی حکومت کو اول ڈویژن قرار دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۷۷۶ء
سے جب کہ انگلستان کے ہاتھوں سے امریکہ نکلا ہے جب سے انگریزوں
نے یہ سبق سیکھا ہے کہ وہ حتی الامکان کسی ملک کو اپنے سے بے تعلق نہیں
ہونے دیتے اور کچھ نہیں تو دوستی ہی کی مد میں شامل رکھتے ہیں۔ چنانچہ
انگلستان نے جب کینیڈا والوں کی آنکھیں بدلی دیکھیں تو اُنھیں
نوآبادیات کی حکومت عطا فرمادی اسی طرح پچھلے دنوں آئرلینڈ کو حکومت
خود اختیاری دے دی نیز جنوبی افریقہ کو اسی قسم کی حکومت دی۔
آج کل مختلف اخبارات اور رسالہ جات میں ایسے مضامین شائع ہوتے
رہتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نوآبادیات روز بروز انگلستان
سے بے نیاز ہوتی جاتی ہیں۔ اسی اندیشہ سے پچھلے دنوں راؤنڈ ٹیبل
گروپ یعنی گول میز کی جماعت کے نام سے ایک جمعیت قائم ہوئی تھی
جس کی تجویز ہے کہ تمام نوآبادیات کی ایک پارلیمنٹ قائم کی جائے
جو تمام نوآبادیات اور خود انگلستان کے اہم مسائل کو طے کیا کرے اور
اُس میں انگلستان کو حق نیابت اُس سے زیادہ حاصل نہ ہو جو نوآبادیات
کو حاصل ہے۔ غرضکہ عملی طور پر اگر دیکھا جائے تو اس وقت بھی نوآبادیات کو

ایک حدتک کامل آزادی حاصل ہے اور اگر اس سے بھی زیادہ آزادی کا شوق اہلِ ہند کو ہے تو نو آبادیات کا حق حاصل ہونے کے بعد جب کسی مسئلہ میں انگلستان سے اختلاف ہو تو بمقابلہ موجودہ بیکسی کی حالت کے اس وقت کامل آزادی کا اعلان آسانی سے کیا جاسکے گا اور وہ پرمعنی بھی ہوگا اور مثل موجودہ حالت کے محض ہوائی اور خیالی نہ ہوگا ۔ اسی سلسلہ میں یہ عرض ہے کہ حکومت نو آبادیات تو ایسی چیز ہے جس کا مطالبہ ہوسکتا ہے ۔ اس لیے کہ خود سلطنت کو اس کا دینا تسلیم ہے ۔ صرف ملنے کے زمانہ اور مدت وقت میں تامل اور کلام ہے ۔ مگر کامل آزادی تو ایسی چیز نہیں جس کا مطالبہ کیا جاسکے ۔ اس کا انحصار تو قوت پر ہے ۔ جس وقت قوت عمل پیدا ہوجائے اس وقت اس کا اعلان کردیا جائے ۔ اس سے قبل نو آبادیات کے مطالبہ میں کھنڈت ڈالی جاتی ہے ۔ جس کے نہ ملنے سے سخت مالی نقصان ہورہا ہے ۔ اس بارہ میں اس رسالہ کے فقرہ ۔ ۳۴ میں عرض کیا گیا ہے کہ آئرلینڈ نے کس طرح لندن کی ایک کمپنی کو جو مکھن سازی کا کام وہاں کرتی تھی اس کی لاگت کا روپیہ دیکر چلتا کردیا ۔ اور اپنے ملک کے غرباء کو بلا سودی سرمایہ دیکر وہ کارخانہ انجمن امداد باہمی کے سپرد کردیا ۔ موجودہ حالت میں اگر ہندوستان کو موعودہ حاکمیت خوداختیاری مل جائے تو کیا اس سے یہاں کے افلاس کے مسئلہ کا حل نہ ہوجائے گا اور اس سے ننانوے فی صدی مسلمانوں کو نفع نہ پہونچے گا ۔ حیرت ہے کہ باوجود ملک اور قوم کے

بے شمار منافع کے مسلمانوں کی ایک جماعت ایک طرف تو کامل آزادی کا
رزولیوشن پاس کرتی ہے۔ اور دوسری طرف سائمن کمیشن کی
خدمت میں مسلمانوں کی جداگانہ نیابت کا حق قائم رکھنے کے لیے
حاضر ہوتی ہے۔ جس سے ہمیشہ کے لیے حکومت خود اختیاری کی
جڑ کٹتی ہے۔ اس کا جوڑ تو کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔

(۴) تحفظ حقوق کا اطمینان۔

سب سے آخر مگر سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ نوآبادیات کی حکومت
قائم ہو جانے پر مسلمانوں کے مذہبی اور تمدنی حقوق کی حفاظت کس طرح
ہو گی۔ اس کی نسبت آل پارٹیز کانفرنس کے فیصلہ میں چند دفعات قائم
کر دی گئی ہیں اور امید ہے کہ اس کے آیندہ[1] اجلاس میں جو آخر دسمبر
میں کلکتہ میں منعقد ہو گا اور ضروری امور کا اضافہ بھی کر دیا جائے گا۔ گزشتہ
جنگ عظیم کے بعد یورپ میں چند جمہوری ریاستیں جدید قائم ہوئی ہیں اور

[1] کلکتہ کے اس اجلاس میں۔ باہمی اختلافات کی وجہ سے خود نہرو رپورٹ
ہی معرض التوا میں پڑ گئی۔ اس لیے مسلمانوں کے مندرجہ بالا حقوق کی حفاظت
کا مسئلہ غیر منفصل رہا اور کانگریس کی کنونشن نے حسب ذیل تجویز پاس کی "موجودہ
حالات کے مدنظر کانگریس کنونشن کے پاس کردہ دستور اساسی کو قابل قبول
سمجھتی ہے۔ بشرطیکہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء تک اسے پارلیمنٹ منظور کرے ورنہ اس تاریخ سے
کانگریس پر امن ترک موالات شروع کر دیگی اور لوگوں کو ٹیکس وغیرہ ادا کرنیکا مشورہ دیگی"۔

اُن میں بھی اقلیتوں کی حفاظت کے لیئے وہاں کے نظام اساسی میں چند دفعات رکھی گئی ہیں اِن دفعات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے جو حقوق نہرو رپورٹ میں تسلیم کیے گئے ہیں وہ یورپ کی قلیل التعداد جماعتوں کے حقوق سے کہیں زیادہ ہیں۔

حقوق تسلیم ہونے کے بعد اُن حقوق پر عملدرآمد ہونے کا مسئلہ ہے اس بارہ میں یوراپ کی جمہوری سلطنتوں اور ریاستوں کے نظام پر نظر کرنی پڑے گی۔ وہاں ایک تو پُرانی سلطنتیں ہیں اور دوسری وہ ہیں جو گزشتہ جنگ عظیم میں بنی ہیں۔ جو پُرانی سلطنتیں ہیں اُن میں تو قلیل تعداد جماعتوں کے لیئے کسی حفاظت کا قانون نہیں ہے۔ خود جمہوری قانون ہی اس امر کی ضمانت ہے کہ وہاں کسی مذہب اور عقیدہ رکھنے والے کی ترقی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ چنانچہ خود انگلستان میں ہی قلیل التعداد یہودیوں کا سلطنت میں کافی اثر ہے۔ اور وہاں کا ایک یہودی مسٹر مانٹیگو ہندوستان کو گزشتہ اصلاحات دے کر دفعتاً اس قدر آگے بڑھا گیا جس کی کم لوگوں کو توقع تھی۔

یورپ میں دوسری قسم کی وہ ریاستیں ہیں جو جنگ عظیم کے بعد قائم ہوئی ہیں اُن میں ایک وہ ہیں جن کا تعلق دنیا کی سلطنتوں کی پنچایت سے ہے جس کا نام لیگ آف نیشنس ہے۔ وہاں جب کسی اقلیت کی حق تلفی ہو تو وہ لیگ مذکور سے اپیل کرسکتی ہے۔ اور دوسری قسم وہ ہے جنہوں نے خود اپنی عدالت العالیہ اس کام کے لیئے قائم کردی ہے۔ جنتک

ہندوستان کا درجہ نوآبادیات کا رہے گا۔ تب تک وہ آخرالذکر قسم کے نظام کے تحت میں رہے گا۔ اور یہ وہی صورت ہے جو اب بھی ہندوستان میں قائم ہے۔ یعنی یہ کہ اگر مسلمانوں کی کسی مذہبی مسئلہ میں حق تلفی ہو تو اوّل وہ مسئلہ ملک کی عدالت العالیہ میں پیش ہوتا ہے اُس کے بعد شاہی پریوی کونسل میں اُس کا اپیل ہوسکتا ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حکومت نوآبادیات ہوجانے سے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت میں کوئی کمی آجائے گی۔

البتہ نوآبادیات کی حکومت قائم ہوجانے کے بعد جو خاص صورت قائم ہوجائے گی وہ یہ ہوگی کہ ہندوستان کی حکومت، انگلستان کے سرمایہ داروں اور دولتمندوں کے ہاتھوں سے نکل کر ہندوستان کے غریب ووٹروں کے ہاتھوں میں آجائے گی۔ اِس وقت بالعموم ہندوستان کے عوام الناس کی اور بالخصوص غریب مسلمانوں کی بڑی مصیبت یہی ہے کہ صنعت وحرفت اور زمینداریوں پر ایسے محصول لگے ہوئے ہیں جن سے وہ برباد ہو رہے ہیں اور اُن کے ملک کا روپیہ غیر ممالک کو کھنچا چلا جارہا ہے مگر نوآبادیات کی قسم کی حکومت قائم ہوجانے سے اس مصیبت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مثلاً آسٹریا کی نوآبادی کی حالت ہمارے سامنے ہے۔ وہاں کی نسبت لارڈ ہیرالس نے لکھا ہے کہ:۔

"آسٹریلیا میں ۱۹۱۰ء میں مزدوروں کی جماعت کا غلبہ ہوا اور اُن کی وزارت قائم ہوئی اور انقلابی زمانہ کو چھوڑ کر باقی ماندہ زمانہ میں

وہاں کی حکومت اعلیٰ طبقے سے نکل کر ادنیٰ طبقے کے ہاتھوں میں رہی۔ اور لطف یہ ہوا کہ بجائے اس کے کہ زمیندار اور سرمایہ دار غربا پر ٹیکس کی تشخیص کرتے وہی غربا تشخیص کرنے والے تھے جو ٹیکس ادا کرتے ہیں۔[1]

(۱) اسی طرح لارڈ موصوف نے کونسل کے ممبران کی انتخابی قابلیت کی نسبت لکھا ہے کہ :-

"برطانیہ میں جو اُمیدوار خوش حال اور تعلیم یافتہ ہوتا ہے اُسے زیادہ ووٹ ملنے کی اُمید ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے آسٹریلیا میں دولتمند لوگ مشتبہ نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس لیے اُس ملک میں جو لوگ خوش حال ہوتے ہیں اُنھیں ممبری ملنے میں دقتیں پیش آتی ہیں"[2]

ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے جب کہ آسٹریلیا کی نظیر موجود ہے تو اُنھیں حکومت نو آبادیات سے خائف ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس وقت ہندوستان میں صرف مسلمان ہی مفلس نہیں بلکہ ہر قوم کے کاشتکار اور کاریگر بھی سخت بدحال ہیں۔ اور ہندو ہوں یا مسلمان سب کے سب چند بڑے زمینداروں۔ اور سرمایہ داروں کے چنگلوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ بڑے زمیندار اور بڑے سرمایہ دار کا لفظ محض ہندوستان کی عام مفلسانہ حالت کی

---

[1] دنیا کی جمہوری ریاستیں مصنفہ لارڈ برائس صفحہ ۲۸۱

[2] " " " " صفحہ ۲۳۳

نسبت سے استعمال کیا گیا ہے۔ ورنہ تمام سرمایہ غیر ممالک کو چلے جانے سے یہاں حقیقی معنوں میں سرمایہ داروں کا وجود ہی نہیں رہا۔ ملک میں صرف تھوڑے سے مہاجن باقی رہ گئے ہیں۔ اور چونکہ انہیں غیر ملکی حکومت کے قوانین کی وجہ سے صنعت و حرفت اور تجارت اور جائز طریقوں میں روپیہ لگانے سے کافی نفع نہیں ہوتا جس کی وجوہ اوپر بیان کی گئی ہیں اس لیے مجبوراً وہ دادستند کا پیشہ کر کے غربا پر قابض ہیں اور جدھر چاہتے ہیں انھیں لے جاتے ہیں۔ سرمایہ داروں کے بعد بڑے زمینداروں کی وہ جماعت ہے جو یہ سمجھتی ہے کہ اُن کا وجود اس امر پر منحصر ہے کہ موجودہ نظام حکومت قائم رہے۔ اِسی خیال کی بنا پر اس جماعت کے بعض لوگوں کا جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں یہ طرزِ عمل ہے کہ وہ رجعت پسند حکام کو فرقہ وارانہ اختلاف قائم رکھنے میں مدد دے کر اُن کی خوشنودی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ مگر یہ یقینی امر ہے کہ حکومت تو آبادیات قائم ہوتے ہی اُن کا یہ طلسم ٹوٹ جائے گا۔ اور تمام مذہبی اختلافات اور قومی منافشات ختم ہو کر ہندوستان کے ہر مذہب و ملت کے غربا کی ایک جماعت قائم ہو جائے گی۔ اور وہ آسٹریلیا کی طرح ہندوستان پر حکومت کر کے اُس کا اقتصادی اور تمدنی پایہ بلند کرے گی۔

کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ پنجاب کا قانون انتقال آراضی جس طرح مسلمان زمینداروں کے لیئے مفید ہے اوسی طرح ہندو اور سکھ

زمینداروں کے لیے مفید نہیں ہے۔ اگر اس قانون کو منسوخ کرنے کی کوشش کی جائے تو مسلمانوں کے ساتھ دوسری قوموں کے غریب زمیندار بھی اُسے ناپسند کریں گے۔ ہندوستان میں اس وقت در اصل اقتصادی کشمکش ہے محض ایک جماعت نے ذاتی نفع کی بنا پر اُسے مذہبی۔ اور فرقہ وارانہ کشمکش میں تبدیل کر دیا ہے اور اس مفلس ملک میں باجا اور قربانی اور زبان کے مسائل بنائے مخاصمت بنا دیے گئے ہیں۔ حالانکہ یہاں ہندو مسلمانوں کو رہتے ہوئے صدیاں گزر گئی ہیں۔ وہ ایک زبان بولتے ہیں اور ایک دوسرے کے تمدن و معاشرت سے مانوس ہیں۔ برخلاف اس کے سوئٹزرلینڈ ہندوستان کی ایک کمشنری سے زیادہ نہ ہوگا اُس میں مختلف نسل، مختلف زبان اور مختلف مذہب رکھنے والی قومیں آباد ہیں مگر سیاسی امور میں وہاں اختلافات ندارد ہیں اس بارہ میں لارڈ برائس نے لکھا ہے کہ:۔

"اس ملک میں اس قدر مختلف اور متضاد عناصر جمع ہیں کہ اُن میں اتحاد ہونا تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ ہے آبادی کے دو تہائی اشخاص جرمن زبان بولتے ہیں۔ اُن سے کم رومن زبان بولتے ہیں اور جرمن اور فرنچ زبانیں بولنے والوں میں زیادہ تر پروٹسٹنٹ عقیدہ رکھنے والے ہیں۔ باقی ماندہ رومن کیتھولک ہیں۔۔۔۔۔۔ اور اگرچہ وہ متحد ہیں تاہم اُن میں یکسانیت نہیں ہے۔ اُن میں

نہ صرف زبان کا اختلاف ہے بلکہ اُن کے ذرائع معاش اور پیشوں اور مذہب و تمدن ۔ عادات و اطوار اور خیالات و عقائد میں فرق ہے ۔ مگران سب باتوں کے ساتھ اتحاد و اتفاق کی ایسی روایات قائم ہوگئی ہیں جن پر وہ لوگ فخر کرتے ہیں اور یہ جذبات تمام فرقہ وارانہ اختلافات پر غالب آکر اُن میں یگانگت قائم رکھتے ہیں ۔" (صفحہ ۳۷۰ ۔ ۳۷۱ کتاب مذکور)

مذہبی اختلافات کی نسبت لارڈ موصوف نے تحریر فرمایا ہے کہ :۔

"وہاں چونکہ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے مابین اختلاف ہے اس لیے وہاں کے قانون میں مذہب کے متعلق دفعات قائم کی گئی ہیں اور اس امر کی ضمانت کی گئی ہے کہ اخلاق اور امن عامہ کو مدنظر رکھ کر عقیدہ اور عبادت کی آزادی دی جائے ۔" (صفحہ ۳۸۴)

سوئزرلینڈ کی تمام حالت کا خلاصہ لارڈ برائس نے ان الفاظ میں کیا ہے :۔

"تمام یورپ میں کسی مقام پر مختلف قسم کی پارٹیاں بننے کے اتنے مواقع نہیں ہیں جتنے کہ اس ملک میں ہیں جہاں کہ قومی خصوصیات، مذہب، زبان، صنعت کی مختلف اقسام اور اقتصادی اغراض کے اعتبار سے تضاد اور مخالفت ہے ۔ تاہم یہاں کی سلطنت کا جہاز پارٹی بندیوں

کے جھکولوں سے جس قدر محفوظ ہے اتنا کسی ملک میں نہیں ہے" (صفحہ ۴۵۶)

واقعہ یہ ہے کہ حقوق کی حفاظت کے خیالات صرف اُس وقت پیدا ہوتے ہیں جب کہ ایک جماعت حاکم اور دوسری محکوم ہوتی ہے سلطنت کا پُرانا مفہوم ہی یہ ہے کہ بے لگام حکومت ہو اور اس لیے سلطنت کے لفظ کا اطلاق جمہوریت پر نہیں ہوسکتا۔ دراصل جمہوریت کے لیے مناسب لفظ سلطنت نہیں بلکہ حکومت خود اختیاری ہے۔ خوش نصیبی سے دنیا میں اب جمہوریت کا دور آگیا ہے۔ بیس سال کے عرصہ میں تقریباً بے لگام سلطنتوں کا خاتمہ ہوچکا اور وہ جمہوریت بن گئی ہیں۔ جمہوریت بنتے وقت اُن ممالک میں ضرور کشت وخون ہوئے۔ مگر امن قائم ہوجانے کے بعد اُن میں سے کسی میں بھی خونریزی کی رُوح باقی نہیں رہی۔ ہر ملک میں جمہوریت ہونے کے بعد ہی سپاہیوں نے اپنے ہتھیار رکھ دیئے۔ اور وہ بھلے آدمیوں کی سی پُرامن زندگی بسر کرنے لگے۔ سب سے اخیر مثال ترکوں کی ہے۔ جنھوں نے حال ہی میں جمہوریت میں قدم رکھا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک وہ اپنی جنگجوئی اور خونخواری کے لیے دنیا بھر میں مشہور تھے۔ مگر جدید جمہوریت کی ہوا لگتے ہی اُن کی تمام پُرانی خصوصیات غائب ہوگئیں اور اب وہ دماغی نشوونما اور امن اور ترقی کی شاہراہ پر پڑ گئے۔

اسی طرح روس کے کسانوں کی حالت ملاحظہ فرمایئے جو صرف دس

سال قبل قطعاً وحشی تھے۔ مگر اب جدید جمہوریت کی برکت سے ایک جدید طرز حکومت کا جو بعض فلسفیوں کا محض تخیل تھا تجربہ کر رہے ہیں اور جو کم و بیش کامیاب ہو رہا ہے۔ اِن حالات سے سمجھ میں آتا ہے کہ ہندوستان میں جمہوریت کا تجربہ خدانخواستہ کیوں ناکام ہوگا۔ اور وہ ہندو جو صدیوں سے لڑائی کے مخالف رہے ہیں۔ جمہوریت قائم ہوتے ہی ہتھیار اُٹھا لیں گے اور اُن مسلمانوں کو مار ڈالیں گے جنھوں نے اس ملک پر اُس زمانہ میں حکومت کی تھی۔ جب کہ ہر شخص کو یہاں ہتھیار رکھنے کی آزادی تھی۔

در اصل جمہوریت میں امن رہنے کی خاص وجوہ ہوتی ہیں۔ جس ملک میں شخصی یا جماعتی حکومت ہوتی ہے اُس میں اختیارات ایک یا چند اشخاص کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ با اختیار لوگ قدرتی طور پر اپنی قوت دوسروں کو دبانے اور مغلوب کرنے میں صرف کرتے رہتے ہیں۔ اُن کے نزدیک جنگ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی کیونکہ زندگی کا محصول اُنھیں رعایا سے وصول ہوتا ہے اور اُس کا نفع اُنھیں پہونچتا ہے۔ مگر جمہوریت میں لڑائی اُن عوام الناس کے اختیار میں ہوتی ہے جن پر لڑائی کے مضر اثرات پڑتے ہیں۔ اُن کے لیے لڑائی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اُن کا کاروبار بند ہو جائے۔ اُن کی اولاد اور عزیز و اقارب کی جانیں ضائع ہوں۔ اُن کے نزدیک لڑائی جیت کر ملک میں توسیع ہونے سے اُن شدید نقصانات کی جو جنگ

میں ہونے ہیں - تلافی نہیں ہو سکتی۔ یہی وجوہ ہیں جن سے جمہوری حکومتیں لڑائی سے بچتی ہیں - اس وقت ہمارے سامنے امریکہ کی مثال موجود ہے جو دولت وثروت کے اعتبار سے دنیا میں اول نمبر پر ہے - میکسکو اس کا غریب ہمسایہ ملک ہے اور اس میں گزشتہ بیس سال سے بدامنی ہے اس دوران میں متعدد بار امریکہ کو اپنی فوجیں وہاں کی بدامنی رفع کرنے اور بغاوتیں فرو کرنے کے لیے بھیجنی پڑیں مگر کبھی ایسا نہ ہوا کہ امن قائم کرنے کے بعد امریکہ نے اپنا قبضہ وہاں رکھا ہو بلکہ فوراً اپنی فوجوں کو واپس بلا لیا۔ غرض کہ یہ تمام مثالیں ایسی ہیں کہ ہندوستان میں جمہوریت قائم ہو جانے کے بعد اقلیتوں کی حفاظت کے مسئلہ کی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی۔

لیکن اگر بفرض محال یہ سمجھ بھی لیا جائے کہ ہندوستان میں جمہوریت قائم ہو جانے کے بعد مذہبی اور قومی اختلافات اور فسادات قائم رہیں گے تو یہ تسلیم کرنے کی کونسی وجہ ہے کہ اس میں مسلمان ہلاک ہو جائیں گے - ہمارے سامنے صوبۂ متحدہ کی حالت موجود ہے جہاں مسلمان صرف ۱۴ یا ۱۵ فی صدی ہیں مگر گزشتہ پانچ سال کے بلووں میں اونہوں نے اپنی تعداد سے دو گنے آدمیوں کو مقابلہ میں زخمی کیا ہے - البتہ جو نقصان اونہیں پہونچا ہے وہ عدالتوں سے پہونچا ہے - چنانچہ بریلی کے بلوہ میں سات مسلمان اور سات ہندو

قتل ہوئے تھے - مگر معلوم ہوا ہے کہ سات مسلمانوں کو سزائے موت ہوئی اور ہندو ایک بھی سزایاب نہیں ہوا اس کا الزام اُن عہدہ داروں پر نہیں ہے جنہوں نے مسلمانوں کا چالان کیا - اور اونہیں سزائیں دیں - بلکہ اوس نظام پر ہے جس نے دولت کو حد سے زیادہ غلبہ دے دیا اور قانونی ضابطہ ایسا قائم کر دیا کہ اوس کے منازل سے گزرنے میں ہر ہر قدم پر روپیہ کا صرف ہے حقیقت یہ ہے کہ مقدمات کے تصفیہ کا موجودہ طریقہ جس کا انحصار جھوٹے گواہوں اور مذہبی فرقہ بندیوں پر ہے - اگر بند کر کے ہندوستان میں انصاف کا پرانا طریقہ قائم کر دیا جائے اور فیصلوں کا انحصار صداقت اور حق گوئی پر ہو جائے تو مسلمان جنگ و جدل میں بھی ٹوٹے میں نہ رہیں گے - اب موجودہ حالت سے نکلنے کا علاج صرف یہ ہے کہ مسلمان اپنے کمزوری کا خیال نکال دیں اور یہ عقیدہ ترک کر دیں کہ اس ملک میں اُن کی زندگی کا انحصار رجعت پسند حکام کی خوشنودی مزاج پر ہے اونہیں چاہیئے کہ برادران وطن کے ساتھ حکومت خود اختیاری حاصل کرنے میں شریک ہوں جس کے ملنے پر اُن کی مالی مشکلات کا خاتمہ ہو جائے گا - بفرض محال اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ہندو اونہیں نوکریاں نہ ملنے دیں گے تب بھی ملک کا روپیہ ملک میں رہنے سے ہر پیشہ اور کام میں برکت ہوگی - اور ۹۹ فی صدی مسلمانوں کے لیے

معاش کی راہیں جو اب بند ہیں کھل جائیں گی۔ انتخابی جماعتوں میں اُن کی تعداد مقرر کر دی گئی ہے اور باقی ماندہ نشستوں کے لیے وہ کوشش کر سکتے ہیں۔ نوکریوں کے اعتبار سے اب جو قلیل جماعتیں مسلمانوں سے بھی کم ہیں وہ اس پیشہ میں موجود ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ صرف مسلمانوں پر نوکریوں کا دروازہ بند کر دیا جائے اس کے علاوہ دنیا میں بجز کسی چھوٹے ہوئے صوبہ کے کوئی نظام ایسا نہیں جس میں ملازمتوں میں کسی چھوٹی جماعت کا حصّہ تعین کر دیا گیا ہو۔

اب رہا یہ خیال کہ مسلمان اس وقت حکومت میں ہیں اور زمانہ اُن کے موافق نہیں اور وہ کمزور ہیں یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے وہی ٹرکی جس کا نام پچھلے زمانے میں یورپ کا مریض رکھ دیا گیا تھا۔ اب کس طرح اُس نے چولا بدل کر جمہوریت اختیار کی اور تھوڑے وقت میں اُس نے اپنی عزت وحیثیت قائم کر لی ہے۔ اسی طرح ہندوستان کے مسلمان بھی ہمت کر کے جمہوریت کے قائم کرنے میں نمایاں حصّہ لیں تو کامیابی یقینی ہے۔ البتہ اگر انھوں نے بزدلی اور لسپت ہمتی سے کام لیا اور برادران وطن کے مظالم کے بھوت سے ڈر گئے تو اُن کی قومی ہلاکت میں کوئی شبہ باقی نہ رہے گا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد یورپ کے یہودیوں سے کم نہیں ہے جو باوجود ہر قسم کے مظالم برداشت کرنے کے اس وقت وہاں کی منڈیوں اور بنکوں پر چھائے ہوئے ہیں۔

اور سیاسیات میں بھی اُن کا بڑا اثر ہے۔ بہر حال اگر خدانخواستہ کچھ مسلمان ایسے ہیں جو اپنے آپ کو حد درجہ کمزور سمجھ کر نہیں چاہتے کہ وہ بحیثیت قوم کے حکومت خود اختیاری کے مطالبہ میں برادرانِ وطن کے شریک ہوں تو اُن اصحاب کی خدمت میں جو اس تحریک کے مخالف ہیں یہ عرض ہے کہ ان مطالبات کی مخالفت کر کے رجعت پسند حکام کے ہاتھ مضبوط کرنے کے مقابلہ میں مسلمانوں کی قوم کے لیے یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ مسلمان سیاسیات میں کنارہ کشی اور خاموشی اختیار کر لیں اور اس امر کے موردِ الزام نہ بنیں کہ انہوں نے رجعت پسند اصحاب کا آلۂ کار بن کر ملک کی ترقی میں مزاحمت پیدا کی۔ ایسے اصحاب نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ کم و بیش برادرانِ وطن میں بھی موجود ہیں اور اُن کی مخالفتوں کے باوجود ہندوستان نے سیاسی میدان میں کچھ نہ کچھ ضرور قدم آگے بڑھایا ہے اور آئندہ بھی بڑھائیگا۔ البتہ اُس قوم کے لوگوں کو آئندہ زمانہ میں شرمسار ہونا پڑے گا۔ جس میں زیادہ تعداد مزاحمت پیدا کرنے والوں۔ اور ترقی میں روڑہ اٹکانے والوں کی نمایاں اور پیش پیش ہوگی باوجود ان مایوسانہ خیالات کے جو ہم نے مسلمانوں کی ایک جماعت کی نسبت ظاہر کیے ہیں۔ ہمیں امید کامل ہے کہ مسلمانانِ ہند بحیثیت قوم کے حکومت نوآبادیات کی تحریک میں شریک ہوں گے اور اُسے کامیاب بنانے میں نمایاں حصہ لیں گے۔ اور ان

کی کوشش سے یہہ ملک پھر ایک بار بقول لارڈ میکالے کے باغِ ارم بن کر دولت و ثروت اور سر سبزی میں دنیا کے متمدن ممالک کو مات دینے کے قابل ہو جائے گا۔

۱۶۔ حکمراں اصحاب کی خدمت میں التماس

اس کتاب کا بڑا حصہ اُن نیک دل انگریز حکام کے کارنامے دکھانے میں صرف ہوا ہے جنہوں نے انگریزی عملداری کے ابتدائی زمانہ میں ہندوستان کی مادی ترقی کے لیے تدابیر اختیار کرنے میں کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی تھی اور اب جب کہ اُس زمانہ کے مقابلہ میں ہندوستان کہیں زیادہ مفلس ہو کر امداد کا کہیں زیادہ حاجتمند ہے سخت ضرورت ہے کہ اُسی قوم کے فراخ دل اصحاب میدانِ عمل میں آکر اُس کام کو مکمل کرا دیں جس کو اُن کے بزرگوں نے شروع کیا تھا۔ کچھ عرصہ سے دنیا جس سرعت کے ساتھ ترقی کی طرف مائل ہے اور قومیت اور آزادی کی جو لہر تمام دنیا میں پھیل رہی ہے وہ اس بات کی علامت ہے کہ اب دنیا کے تمام پس ماندہ ممالک بہیمیت اور پستی سے نکل کر۔ اور مہذب ممالک کے قدم بہ قدم چل کر تمام کرۂ ارض کی رونق بڑھائینگے اور زیادہ زمانہ نہیں گزرے گا کہ ایشیائی ممالک کے غربا کو بھی پیٹ بھر کر روٹی اور بدن ڈھانپنے کو کپڑا ملے گا۔ اور سخت گیر حکمرانوں کا کوئی قانون اور سخت دل سرمایہ داروں کی کوئی زر پاشی ترقی کی اس لہر کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔ پس عین وقت ہے کہ

انگریزی قوم جس کو دُنیا سے غلامی کے مٹانے کا دعویٰ ابھی طور پہ فخر رہا ہے
اُس کے نیاب دل افراد اپنے محلّات اور اپنی آرام گاہوں سے نکل کر
اُس ہندوستان کو جس کی بدولت دنیا کی معزز ترین قوم بنے ہوئے
ہیں اپنی سلطنت کے زیر سایہ اپنی نوآبادیات کی برابری کا درجہ عطا کرنے
میں مدد دے کر اُسے اپنا قوت بازو بنائیں کیونکہ اب ہندوستان
کے روز افزوں افلاس کا اثر کچھ عرصہ سے خود انگلستان کی مالی حالت
پر پڑ رہا ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ انگلستان مسلم طور پہ تمام دنیا
میں سب سے زیادہ دولتمند سمجھا جاتا تھا۔ انگلستان کا بنک دُنیا کی
سب سے بڑی قوت سمجھا جاتا تھا اور اُس کا اثر اور اقتدار تمام ممالک
کی منڈیوں پر تھا۔ مگر اب جو اعداد شمار شائع ہوتے رہتے ہیں اُن
سے واضح ہوتا ہے کہ جب کہ امریکہ میں فی کس آمدنی دو ہزار روپیہ سالانہ
تک پہونچ گئی ہے انگلستان میں فی کس آمدنی کل ایک ہزار یعنی امریکہ
سے نصف رہ گئی ہے۔ انگلستان کی صنعت اب گر گئی کیونکہ ہندوستان
جو انگلستان کے تیار کردہ مال کی منڈی تھا اُس میں روز افزوں افلاس
کی وجہ سے قوت خرید باقی نہیں رہی۔ اور یہاں کی قوت خرید گھٹ
جانے کی وجہ سے انگلستان میں بیکاروں کی تعداد بڑھنے لگی۔
ابتدائے عملداری میں جب کہ ہندوستان خوش حال تھا انگلستان کے
کارگیروں کو ہندوستان میں اُن کے مال کے خریدار خوب ملے جس سے
اُنھوں نے خوب چین کیے۔ مگر چونکہ اُن کے ہاتھوں میں تمام وہ قوت

تھی جو ہندوستان میں اُن کی تجارت پھیلانے میں ممد ہوتی تھی۔
اس لیئے انگریزوں کو تجارتی کشمکش میں پڑنے کی عادت نہ رہی اور
وہ آرام طلب ہو گئے اور صنعت و تجارت میں دوسری قوموں کا
مقابلہ کرنے کے قابل نہ رہے۔ برخلاف اس کے یورپ اور امریکہ کی قومیں
کی تجارت و صنعت کی راہ میں جو رکاوٹیں ڈالی گئیں انھوں نے اُن
میں تجارتی مقابلہ کی قوت اور قابلیت بڑھا دی نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی
صنعت و تجارت، مقابلہ کی تاب نہ لا سکی۔ چنانچہ موٹر کار بنانے کی صنعت
اب تمام تر جرمنی اور امریکہ کے ہاتھوں میں ہے اور انگلستان سے تقریباً
وہ مفقود ہو چکی ہے۔ سینما کے لیئے فلم بنانے کے کارخانے جو انگلستان میں
تھے وہ ختم ہو کر اُن کی جگہ آڑھت کی دکانیں قائم کر دی گئیں جہاں جرمنی
اور امریکہ کے بنائے ہوئے فلم منگا کر فروخت کیئے جاتے ہیں۔ انگلستان
میں قانوناً سینما کا تماشا کرنے والوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ ایک خاص تعداد
میں انگلستان کی بنائی ہوئی فلمیں رکھیں مگر سب بیکار ثابت ہوا۔ دو
سال کا عرصہ ہوا جب کہ دارالخواص کے لیئے چمڑے کا فرنیچر جرمنی کی ایک
دوکان سے اس لیئے خریدنا پڑا کہ وہ انگلستان کے مقابلہ میں ارزاں تھا۔
اس پر انگلستان کے چمڑے کے کارخانہ داروں نے سخت ناراضی کا اظہار کیا۔
یہاں تک سنا گیا ہے کہ انگلستان کی ریلوں کی کمپنیوں نے انجن اور ریلوے
کا سامان جرمنی کے کارخانوں سے چوری سے خرید کر منگایا جس کی انھیں
ممانعت تھی۔ انگلستان کی خاص صنعت عرصہ دراز سے پارچہ بافی تھی

مگر اس کے متعلق حسب ذیل واقعہ پیش آیا جسے معلوم کر کے ناظرین کو حیرت ہوگی۔ وہ یہ کہ برطانیہ نے اپنی نوآبادیات کو مجبور کیا کہ وہ برطانیہ کے مال پر محصول گھٹا دیں تاکہ وہ وہاں پہونچکر ارزاں پڑے مگر چونکہ خود انگلستان میں مال بہت کم تیار ہوتا تھا اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں انگلستان کے نام سے بنتا تھا اس لیئے اس بارہ میں آسٹریلیا والوں نے دریافت کیا کہ کس مال کو انگلستان کا مال سمجھا جائے۔ بالآخر حیل وحجت کے بعد طے ہوا کہ جس مال میں انگلستان کا سرمایہ اور محنت بقدر پچیس فی صدی کے لگا ہو اُسے انگلستان کا مال قرار دیا جائے۔ مگر اس طریقے سے یورپ کا سستا بنا ہوا مال انگریزی مال کے نام سے آکر اُن ملکوں میں مہنگا پڑنے لگا۔ مثلاً گھڑیوں کے پُرزے جو یورپ کے براعظم میں سستے تیار ہوتے وہ انگلستان کے مہنگے بنے ہوئے ڈھکنوں میں رکھکر فروخت کیے جاتے اور چونکہ پرزوں کے مقابلے میں ڈھکنوں کی قیمت زیادہ ہوتی ہے اس لیے وہ انگلستان کا مال قرار دیئے جاتے۔ آسٹریلیا والوں نے اس پر اعتراض کیا اور اصرار کیا کہ پچیس فی صدی کی جگہ پچھتر فی صدی کی شرط کر دی جائے اس سے انگلستان کے کارخانہ دار سخت برہم ہوئے اور اُنھوں نے کہا کہ جو کپڑا وہ تیار کرتے ہیں وہ بھی تو پچھتر فی صدی کی تعریف میں نہیں آتا۔ غرض کہ اس واقعہ سے انگلستان کی صنعت و تجارت گر جانے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

اسی طرح برطانیہ کے کاریگروں کی قابلیت پر نظر ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ مزدوروں کے معاوضہ کی شرح سے بخوبی ہوسکتا ہے جس کی تفصیلات یہ ہیں :۔

نام پیشہ	صوبجات متحدہ امریکہ	برطانیہ
انجن کا بوائلر بنانیوالا	۳۴ر۵۶ ڈالر	۲۰ر۴۵
لوہار	۳۰ر۲۸ "	۱۶ر۲۲
مشین ساز	۳۴ر۵۶ "	۱۶ر۲۲
بڑھئی	۳۴ر۵۶ "	۱۶ر۲۲
نمونہ ساز	۳۸ر۴۰ "	۱۹ر۰۴
جوڑ ملانے والے	۳۴ر۵۶ "	۱۶ر۲۲
بجلی والے	۳۴ر۵۶ "	۱۶ر۲۲
مزدور	۲۳ر۰۰ "	۱۲ر۶۹
(ماخوذ از ٹائمز ٹریڈ سپلیمنٹ صفحہ ۱۹۲۵)		

اس نقشہ سے واضح ہوتا ہے کہ امریکہ کے کاریگروں کی اُجرت بعض صورتوں میں انگلستان کے کاریگروں سے دوگنی سے زیادہ ہوتی ہے باوجود اس کے کہ امریکہ کا مال انگلستان کے مال سے سستا تیار ہوتا ہے۔ مثلاً امریکہ کی موٹر کار جو دو ہزار روپیہ میں ملتی ہے اُس کے

مقابلہ میں انگلستان کی سب سے زیادہ سستی موٹر کار جو مارس کولی کے کارخانہ میں تیار ہوتی ہے اس سے دوگنی قیمت میں ملتی ہے۔ مارس کولی کا رخانہ وہ ہے جو امریکہ کے فورڈ کے کارخانہ کے مقابلہ میں جاری کیا گیا تھا۔ ایسے کارخانے میں اس قدر زیادہ گراں مال تیار ہونا تعجبات سے ہے اسی بارہ میں ایک انگریز سیاح نے اپنے امریکہ کے سفر کے بعد کہا کہ امریکہ سے وسیع پیمانہ پر مال تیار کرنے میں مقابلہ کرنے کا وقت گزر گیا اب تو انگلستان کو چاہیئے کہ تکلفات کی چھوٹی موٹی چیزیں جو تحفہ تحائف میں دینے کے قابل ہوں اور جن کی قیمت عام طور پر لوگوں کو معلوم نہیں ہوتی تیار کیا کرے۔

خلاصہ یہ کہ امریکہ کا کاریگر دوگنی مزدوری لیکر انگلستان کے مقابلہ میں نصف قیمت پر مال تیار کرتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ انگلستان کے کاریگر سے چارگونہ زیادہ ہوشیار ہے۔ اگر سچ پوچھو تو ہندوستان سے بے شمار آمدنی کے سہارے نے انگلستان کے لوگوں کو کاہل وجود اور سست بنا دیا ہے۔ اور ان کی حالت ہندوستان کے پیرزادوں کی مانند ہوگئی ہے جو اپنے مریدوں کی آمدنی کھاتے کھاتے محنت و مشقت کرنے کے عادی نہیں رہتے اور اُن کے دماغوں میں اپنی برتری کے خیالات جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ اس طرز عمل کا نتیجہ انگلستان اور ہندوستان دونوں کے لیے بربادی ہے۔ ایک مفت کی آمدنی سے اپنے پایہ سے گزر رہا ہے تو دوسرا اشدت

افلاس سے ۔ پس دونوں ملکوں کا نفع اسی میں ہے کہ دونوں اپنی اپنی
جگہ اپنے بل بوتے پر کھڑے ہو کر کسب معاش کے صحیح طریقے اختیار
کریں اور ضرورت کے وقت ایک دوسرے کے کام آئیں ۔ جس رفتار
سے اب دنیا کے متمدن ممالک ترقی کے میدان میں گامزن ہیں ۔
انگلستان کا اس رفتار کو قائم رکھ کر ان کے ساتھ ساتھ چلنا اس
امر پر منحصر ہے کہ اس اپنے زیر اثر ملک کو جس میں وسائل ترقی کی
کوئی کمی نہیں ۔ اس قابل بنا دے کہ اس کے باشندوں کا شمار
"مرنے والی مکھیوں" کے زمرہ سے نکل کر انسانوں میں کیا جانے لگے
یہ ظاہر ہے کہ اس خیال کے انگریز پہلے زمانہ میں بہ کثرت ہوتے تھے ۔
کتنے انگریز ہندوستانیوں کی طرف سے لڑنے کی وجہ سے ترقیوں
سے محروم رہے کتنے گورنر اور وائسرائے ہندوستان کے نفع
کے لیئے اپنے عہدے چھوڑ کر چلے گئے اور کم وبیش اب بھی کچھ نہ کچھ لوگ
ایسے موجود ہیں ۔ چنانچہ جہاں تک ہمارا محدود علم ہے اس حکمران جماعت
میں جسے اہل ہند بیوروکریسی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں ۔ بہ کثرت درد مند
انگریز موجود ہیں ۔ پنجاب کے کوآپریٹو ڈیپارٹمنٹ میں مسٹر ایچ کیلورٹ
اور ان کے جانشین مثل عیسائی مشنریوں کے کام کرتے ہیں ۔ یہی حال
گوڑگانوہ کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ایف ایل برین کا ہے جنھوں نے صدہا
انجمنہائے امداد باہمی قائم کرا دیں اور نفع عامہ کے بے شمار کام جاری
کرا دیئے ۔ صوبہ متحدہ کی سول سروس میں مسٹر پی ڈبلیو مارشس کا نام

روشن ہے جو غریب کاشتکاروں کی صحبتوں میں بمقابلہ کلبوں اور ڈنروں کے زیادہ خوش رہتے ہیں۔ اور نہ معلوم کتنے ایسے انگریز گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں جو عوام الناس کی بہبودی میں اپنا زیادہ وقت صرف کرتے ہیں۔ مگر حکام بالا کی طرف سے عوام الناس کو اس قدر بدگمانی ہوگئی ہے کہ عام طور پر یہ خیال ہے کہ ایسے افسروں کی جو واقعی طور پر غرباء کو اُبھارنا چاہتے ہیں سلطنت کی طرف سے حوصلہ افزائی نہیں ہوتی۔ خیر یہ خیال صحیح ہو یا غلط مگر جب کہ دُنیا کے اس جدید دور میں تاجدار اپنے تخت سے اُتر کر عوام الناس کی صفوں میں کھڑے ہوتے اور تمام اپنے القاب وآداب چھوڑنے میں اپنی عزت سمجھتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ پاک طینت انگریزوں کی ایک جماعت مسٹر ہیوم اور سر ولیم وڈربرن کی طرح کمربستہ ہوکر اہل ہند کو اُبھارنے کا کام شروع کرے۔ حال میں ہندوستان کی یورپین جماعت کے بعض افراد نے جن میں اخبار پانیر کے ایڈیٹر مسٹر ایف ڈبلیو وسن بھی شامل ہیں اس بارہ میں جو قدم اُٹھایا ہے اُس نے حکومت نوآبادیات کے مطالبہ کی تحریک میں جان ڈال کر خود سلطنت برطانیہ کی جڑوں کو مضبوط کرنے کی بنیاد ڈال دی ہے اور اُمید ہے کہ اس خیال کے اصحاب اہل ہند کو جہالت افلاس اور پستی سے نکال کر دنیا میں اپنا اور اپنی قوم کا نام روشن کریں گے یہ اصحاب یقین رکھیں کہ بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھکر بنی نوع انسان کی خدمت کرنا بمقابلہ ویلیر بو کی پُر تکلف

مٹھائیوں کے کہیں زیادہ پر لطف ہے آخر میں عرض ہے کہ انگریزوں کو نیک کام کرکے دنیا میں نیک نامی اور حقیقی عزت حاصل کرنے کا جو موقع اب مل رہا ہے ممکن ہے کہ پھر کبھی نہ ملے۔ اگر اس موقع کو کھو کر دوسری اقوام کو اس کی نیک نامی کے حاصل کرنے کا موقع دیدیا تو وہ مدت العمر پچھتائیں گے کیونکہ یقینی طور پر اب وہ وقت آگیا ہے کہ کرۂ زمین کا ہر ہر گوشہ آباد ہو کر اور گلزار بن کر رہے گا۔ اس لیئے اگر انگریز اُس حصّہ کو گلزار بنانے میں کوتاہی کریں گے جو اُن کی سپردگی میں دیا گیا ہے تو خداوند تعالےٰ یہ کام دوسروں سے ضرور بالضرور لے گا۔



تتمہ

آزادیِ کامل

۶۲۔ حکومت خود اختیاری کے منصوبہ کی تاریخ

یہہ کتاب " حکومت خود اختیاری" ۱۹۲۸ء میں لکھی گئی تھی جو پچھلے صفحہ پر ختم ہوئی ہے۔ اُس وقت تک اہلِ ہند کا نصب العین حکومت خود اختیاری تھا۔ گزشتہ دس سال میں وہ نشو و نما پاکر " آزادی کامل" کے درجہ تک پہنچ گیا ہے۔ یہہ نشو و نما کن حالات میں اور کس طرح ہوا ذیل کے صفحات میں بیان ہوگا مگر اُس سے قبل حکومت خود اختیاری کا منصوبہ قائم ہونے کی مختصر تاریخ درج ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے جو حسب ذیل ہے۔

حکومت[1] خود اختیاری کی تمنا تو راجہ رام موہن رائے کی تحریرات میں پائی جاتی ہے جو انیسویں صدی کی ابتدا میں بنگال کے ایک مصلح تھے بت ۱۸۴۸ء سے ۱۸۶۰ء تک کنیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کو حکومت خود اختیاری عطا ہوئی جو اہلِ یورپ کی نوآبادیات تھیں۔ مگر ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں اہل ہند اس قدر پس گئے تھے کہ نصف صدی تک اُنھوں نے حکومت خود اختیاری کا نام

[1] یہہ حالات " مسلمانوں کے روشن مستقبل" سے اخذ کیے گئے ہیں۔

تک نہ لیا بالآخر ۱۹۰۸ء کے اجلاس کانگریس منعقدہ سورت میں نوآبادیات کے طرز حکومت کا باضابطہ مطالبہ کیا گیا۔ اس کے نو سال بعد جنگ کے آخری زمانہ میں ۱۹۱۷ء میں شاہی اعلان کے ساتھ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ جاری ہوا جس میں ہندوستانیوں کے لیے ایک "ذمہ دار حکومت" کا لفظ استعمال کیا گیا۔

پھر ۱۹۲۰ء کی تحریک ترک موالات سے متاثر ہوکر ۹ فروری ۱۹۲۱ء کو ڈیوک آف کناٹ نے جدید اسمبلی کا افتتاح کرتے وقت اپنی تقریر میں فرمایا کہ :۔

"آج آپ کے لیئے سوراج کی ابتدا ہو رہی ہے۔ اور آپ کو ترقی کے وسیع ترین اور اعلیٰ درجہ کے مواقع مل رہے ہیں جن سے میری نوآبادیات کے مانند آزادی حاصل ہو"

مگر ڈیڑھ سال بعد جبکہ تحریک مذکور ٹھنڈی پڑ گئی تو ۲ اگست ۱۹۲۲ء کو پارلیمنٹ میں مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ ہماری غرض اصلاحات دینے سے یہ نہیں ہے کہ انجام کار ہم اپنی امانت سے بالکل دستبردار ہو جائیں اور اسی سلسلہ میں کہا کہ بارہ سو کے قریب انگریز عہدہ دار ہندوستان پر ہمیشہ مسلط رہیں گے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں ممبر انڈیا کونسل نے اس تقریر پر احتجاج کرتے ہوئے لکھا کہ وزیر اعظم کی یہ تقریر سابقہ شاہی اعلانات کے منافی تھی۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں کانگریس کے اجلاس منعقدہ مدراس میں بصدارت ڈاکٹر

مختار احمد انصاری "آزادی کامل" کا رزولیوشن پاس ہوا اور قرار پایا کہ سائمن کمیشن کا مقاطعہ کیا جائے۔ اس مقاطعہ کے بعد ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو لارڈ ارون وائسرائے ہند نے اعلان کیا کہ :-

"مجھے ملک معظم کی حکومت کی طرف سے یہہ صاف طور پر بیان کرنے کے اختیارات دیے گئے ہیں کہ ہندوستان کی آئینی ترقی کا قدرتی نتیجہ درجہ نوآبادیات کا حصول ہے"

۴۳۔ آزادی کامل کا اعلان | لیکن جب کانگریس کی طرف سے یہہ اصرار کیا گیا کہ حکومت نوآبادیات کے متعلق صاف الفاظ میں وعدہ کیا جائے اور بتایا جائے کہ گول میز کانفرنس میں اس کی بابت کچھ طے کیا جائے گا یا نہیں تو وائسرائے نے اس کے صاف جواب سے گریز کیا اور کہا کہ اعلان میں جو کچھ ظاہر کیا گیا ہے گورنمنٹ کا نقطہ نظر وہی ہے۔ اس مبہم اور معلق جواب سے اہل ہند کو بہت مایوسی ہوئی۔ ایک طرف تو گورنمنٹ کی طرف سے متعدد اعلانوں اور وعدوں کے باوجود بار بار رجعت کی جا چکی تھی دوسری طرف کانگریس کا کامل آزادی کا رزولیوشن دو سال سے ملتوی چلا آ رہا تھا اور ۱۹۲۸ء کے اجلاس میں یہہ قرار پایا تھا کہ اگر حکومت وقت ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء تک نوآبادیات کی قسم کی حکومت خود اختیاری کا مطالبہ منظور نہ کرلے تو کانگریس ترک موالات کے ساتھ عدم ادائیگی ٹیکس کی مہم شروع کر دیگی۔ ان امور کی بنا پر دسمبر ۱۹۲۹ء کے اجلاس کانگریس منعقدہ لاہور میں یہہ تجویز پاس کی گئی کہ گول میز کانفرنس

کی شرکت بے کار ہے۔ نہرو رپورٹ کی قرارداد کو منسوخ سمجھ کر کامل آزادی کا اعلان کر دیا جائے اور کانگریس کمیٹی کو سول نافرمانی کرنے کا اختیار دیا جائے۔

۴۶۔ سول نافرمانی میں مسلمانوں کی شرکت

یہہ تجویز پاس ہونے کے بعد ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو تمام ہندوستان میں "یوم آزادی" منایا گیا اور ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو مہاتما گاندھی نے نمک بنا کر سول نافرمانی کرنے کی مہم شروع کی۔ جس کو حکومت نے گرفتاریوں، لاٹھیوں، بندوقوں کی باڑ اور آراضی کی ضبطیوں کے ذریعہ دبانے کی کوشش کی۔

اس پر امن جنگ میں مسلمانوں نے انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے شرکت کی۔ گاندھی جی کے گرفتار ہونے پر مسٹر عباس طیب جی سابق جج ہائی کورٹ بڑودہ، ڈکٹیٹر مقرر ہو کر جیل میں بھیجے گئے۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ڈاکٹر سید محمود، تصدق احمد خاں شروانی، مسٹر رفیع احمد قدوائی اور خان عبدالغفار خاں نے اس قومی جنگ میں حصہ لیکر سزائیں بھگتیں اور جماعتی حیثیت سے جمعیۃ العلماء، احرار اسلام اور خدائی خدمتگاروں نے سول نافرمانی میں پوری شرکت کی البتہ مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس اس تحریک سے علٰحدہ رہیں۔

۶۵۔ گول میز کانفرنس میں ناکامی

یہہ وہ وقت تھا جب کہ جدید آئین مرتب کرنے کے لیئے انگلستان میں گول میز کانفرنس کے جلسے ہو رہے تھے۔

تب مارچ ۱۹۳۱ء میں گاندھی جی کو جیل سے رہا کرکے لارڈ ارون وائسرائے نے ان سے گفتگو کی اور باہمی معاہدہ کی رو سے سول نافرمانی مشروط طریقہ پر ملتوی کی گئی۔ اسی سال میں کانگریس کا مشہور اجلاس کراچی میں ہوا جس میں "بنیادی حقوق" کا رزولیوشن پاس کیا گیا۔ اس کے بعد ہی گول میز کانفرنس کا اجلاس لندن میں ہوا جس میں مہاتما گاندھی اپنی خوشی سے نہیں بلکہ کانگریس کمیٹی کے فیصلہ کی مجبوری سے شریک ہوئے۔ کانگریس کمیٹی کا خیال تھا کہ مہاتما گاندھی کی شرکت سے قوم پرستوں کی فتح ہوگی۔ لیکن آخر میں یہ خیال غلط ثابت ہوا کیونکہ فرقہ پرست ہندو اور مسلمان دونوں کی طرف سے وطن پرستی کی مخالفت اور رجعت پسندی کی غیر معمولی نمایش ہوئی اور کانفرنس ناکامی کے ساتھ مسٹر میکڈانلڈ وزیر اعظم کو ثالث بنا کر ختم ہوگئی۔ وزیر صاحب موصوف سے ثالث بننے کی جو درخواست کی گئی اس پر کسی مسلمان رکن کانفرنس نے دستخط نہیں کیے نیز مہاتما گاندھی و مسز نائڈو اور سر تیج بہادر سپرو نے اس درخواست پر دستخط نہیں کیے اور صرف بعض ہندو صاحبان کے دستخطوں سے فرقہ وار مسئلہ کا فیصلہ وزیر اعظم کے سپرد کیا گیا۔ اس فیصلہ کی رو سے قانون ساز مجالس میں مسلمانوں اور دیگر اقوام کی نشستوں کا تعین کر دیا گیا بنگال میں جہاں مسلمانوں کی آبادی ۵۳ فی صدی ہے صرف ۴۷ ½ نشستیں اونہیں دی گئیں اور ۱۳ نشستیں یوروپینوں اور عیسائیوں کو دی گئیں جو اون کی آبادی سے ۲۵ گنا تھیں۔ اسی طرح پنجاب میں مسلمانوں کی تعداد

۵۵ فی صدی ہو مگر انھیں ۴۹ فی صدی نشستیں دی گئیں - ان وجوہ سے مسلمان اس فرقہ وارانہ فیصلہ سے خوش نہ تھے لیکن وزیراعظم نے یہ اجازت دیدی تھی کہ اگر صوبہ کے لوگوں میں باہمی سمجھوتہ ہو جائے تو اس کے مطابق اس تعداد میں تبدیلی ہو سکتی ہے - اس سمجھوتہ کے لیے مختلف کوششیں ہوتی رہیں - لیکن سمجھوتہ نہ ہونا تھا نہ ہوا - ۱۹۳۵ء میں پارلیمنٹ نے نیا انڈیا ایکٹ ہندوستان میں جدید آئین قائم کرنے کے متعلق جاری کر دیا - اور فرقہ وارانہ فیصلہ اس آئین کا جزو بن گیا - ہندوؤں کی ایک نئی پارٹی نیشنلسٹ پارٹی کے نام سے قائم ہوئی جو فرقہ وارانہ فیصلہ کے خلاف تھی - مسلمان یوں تو اس کے خلاف تھے - کیونکہ ان صوبوں میں بھی جہاں ان کی اکثریت تھی وہ اقلیت میں ہو گئے تھے - لیکن یہ دیکھکر کہ ہندو نیشنلسٹ پارٹی اس فیصلہ کے خلاف شورش مچا رہی ہے وہ ڈرے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جو نشستیں فیصلہ ثالثی کی رو سے ان کو ملی ہیں وہ بھی ان سے نکل جائیں - اس لیے مسلمانوں نے فیصلہ ثالثی کے قائم رکھنے کو اپنا مقصد اولیں بنا لیا اور مسلم لیگ نے اسی کی کوشش جاری رکھی کانگریس نے فرقہ وارانہ فیصلہ کے متعلق خاموشی اختیار کی -

۴۶- کانگریس اور مسلم لیگ کا اتحاد خیال

اب نئے آئین کے مطابق جدید انتخاب کا وقت آیا - اس موقع پر مسلم لیگ اور کانگریس میں کوئی خاص معاہدہ تو نہیں ہوا لیکن ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ نے جو پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا اور اس کی طرف سے جو مینی فیسٹو شائع کیا گیا اس میں

ایسی باتیں درج کی گئیں جو کانگریس سے اتحاد عمل کا پتہ دیتی تھیں۔ مثلاً اس میں درج تھا کہ :-

"تمام جابرانہ قوانین منسوخ کر دیے جائیں گے۔ ملک کی اقتصادی لوٹ کو روکا جائے گا۔ حکومت کے گرانبار اخراجات کو گھٹایا جائیگا ابتدائی تعلیم کو مفت کیا جائیگا۔ فوج کے اخراجات گھٹا کر اس کو قومی بنایا جائے گا۔ زراعتی قرضوں کے بار کو گھٹایا جائے گا۔ مسلمانوں کے مذہب زبان اور رسم الخط کی حفاظت کی جائے گی اور ملک میں رائے عامہ پیدا کی جائے گی۔"

غرض ۱۹۳۷ء کے جدید انتخابات اس فضا میں عمل میں آئے جو اس مینی فیسٹو کے اجراء سے پیدا ہو گئی تھی۔ مسلم لیگ کے امیدواروں کو ہر جگہ کانگریس نے مدد دی اور کانگریس کے امیدواروں کے انتخابات کو کامیاب بنانے میں مسلم لیگ نے اپنی کوششوں میں کمی نہیں کی۔ لیکن یہہ فضا زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔

۶۷۔ کانگریس مسلم لیگ میں وجہ اختلاف۔ ان انتخابات میں چھ صوبوں میں کانگریس کی اکثریت رہی۔ اس لیئے کانگریس نے اعلان کردیا کہ وہ خالص کانگریس والوں کی وزارتیں قائم کرے گی۔ البتہ جو امیدوار کانگریس کے اقرارنامہ پر دستخط کر دیں گے ان میں سے وہ اپنی وزارت میں لے لیں گے۔ اگرچہ اس وقت تک کانگریس نے عہدے قبول نہ کیے تھے تاہم اس اظہار پالیسی سے مسلم لیگ کو کانگریس سے

وجہ شکایت پیدا ہو گئی اور اُس کا ظہور پہلی بار اُس وقت ہوا جب کہ پنڈت جواہر لال نہرو صدر کانگریس نے اپنی مدراس کی اسپیچ میں کہا کہ ہندوستان میں صرف دو پارٹیاں ہیں۔ ایک کانگریس، دوسری گورنمنٹ برطانیہ۔ مسٹر جناح نے اس پر کہا کہ نہیں! تیسری جماعت مسلم لیگ بھی ہے پھر اس کی تردید پنڈت نہرو نے کی۔

دوسرا واقعہ یہہ ہوا کہ یکم اپریل سنہ ۱۹۳۷ء کا دن کانگریس نے جدید آئین کے نفاذ کے خلاف عام ہڑتال کرنے کے لیے مقرر کیا تھا مسٹر جناح پریسیڈنٹ لیگ نے مسلمانوں کو ہڑتال کرنے سے منع کر دیا برخلاف اس کے جمعیتہ العلمار نے اس ہڑتال میں کانگریس کے ساتھ شرکت کی۔

پھر جب کانگریس نے وزارتیں لینے سے انکار کر دیا تو گورنمنٹ نے عارضی وزارتیں قائم رکیں۔ اُس وقت صوبہ متحدہ کی مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے صدر نے سرکاری وزارت قبول کر لی جس سے خود مسلم لیگ کے ممبروں میں اختلاف پڑ گیا اور بعض ممبروں نے مسلم لیگ سے استعفے دیدئے۔ بالآخر عارضی وزارتیں ختم ہونے پر کانگریس نے مختلف صوبوں میں وزارتیں لیلیں اور اپنے اعلان کے خلاف صوبہ سرحدی میں غیر کانگریسیوں کو اپنی وزارتوں میں شامل کر لیا۔

اسی دوران میں صوبہ متحدہ میں اسمبلی کی بعض نشستوں کے ضمنی انتخابات پیش آئے۔ جن میں کانگریس اور مسلم لیگ کا مقابلہ ہوا۔ اور

کانگریس نے عام مسلمانوں کو براہ راست ممبر بنانا شروع کیا۔

۶۸۔ مسلم لیگ میں "آزادی کامل" کی تجویز۔ اسی مکدر فضا میں مسلم لیگ کا پچیسواں سالانہ اجلاس مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں ۱۵-۱۶-۱۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو بمقام لکھنؤ منعقد ہوا جس میں مشروط "آزادی کامل" کی تجویز پاس کر دی گئی۔ اس تجویز کے پاس ہو جانے سے ہندوستان میں "حکومت خود اختیاری" کے منصوبہ کا خاتمہ ہو گیا اور تمام ملک اس نقطہ پر آ گیا کہ ملک کو مکمل طریقہ پر آزاد کرا یا جائے۔

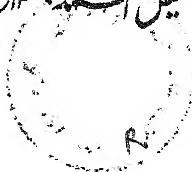
غالباً اسی مشترک جذبے کے تحت میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان سمجھوتہ کی کوششیں شروع ہوئیں۔ اس کی ابتدا ۱۹۳۷ء میں بابو راجندر پرشاد سابق صدر کانگریس اور مسٹر جناح صدر مسلم لیگ کی باہمی خط و کتابت سے ہوئی۔ پھر اسی بارہ میں پنڈت جواہر لال نہرو سابق صدر کانگریس اور مسٹر جناح کے درمیان ۱۹۳۸ء کے شروع سے طویل خط و کتابت ہوئی جو اخبارات میں شائع ہو گئی ہے اور سب سے آخر میں گاندھی جی اور مسٹر جناح میں گفت و شنید ہو کر مسٹر سبھاش چندر بوس پریسیڈنٹ کانگریس اور مسٹر جناح کے درمیان سمجھوتہ کی گفتگو ہوئی جس میں اگرچہ بظاہر ناکامی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اسمبلی اور کونسل کے انتخابات میں مقابلے ہونے سے مسلم عوام کی سیاسی تربیت کا سلسلہ جاری ہو گیا ہے اور امید پڑتی ہے کہ برسوں کا کام دنوں میں انجام پائے گا کیونکہ عوام میں ان باہمی مقابلوں کی بدولت ایک تازہ

روح پیدا ہوگئی ہے اور یہہ آثار بتاتے ہیں کہ آیندہ چل کر کانگریس اور مسلم لیگ میں اتحاد عمل ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ جب مسلم لیگ اور کانگریس کا نصب العین ایک ہی ہے تو اس کی تکمیل میں لیگ کو جب تنہا مشکلات پیش آئیں گی تو آزادی کامل کی منزل تک پہونچنے کے لیئے کانگریس کے ساتھ مل کر کام کرنا ہوگا اور اُس وقت ہندو مسلم مسئلہ کا حل دنیا کے سامنے آجائے گا۔

۶۹۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان سخت اختلافات رونما ہیں اور جگہ جگہ ہندو مسلم بلوے بھی ہو رہے ہیں مگر اُسی کے ساتھ کانگریس کے ہاتھ میں حکومت کی طاقت آجانے کے باعث خود ہندو لبرل اور ہریجن اور ملک کی بعض دوسری جماعتیں جنہیں حکومت میں حصہ نہیں ملا کانگریس کی مخالفت میں مسلم لیگ کی ہم آہنگ ہیں جس کی وجہ سے یہہ کہا جا سکتا ہے کہ ملک میں بجائے فرقہ وارانہ جماعتوں کے مختلف سیاسی جماعتیں بنتی جاتی ہیں جو ملک کی سیاسی ترقی کے لیئے اور بالخصوص مسلمانوں کے لیئے جو اقلیت میں ہیں ایک فال نیک ہے۔ مسلمانوں پر جو ساڑھے ستر سال سے اپنی قومی بربادی کا مرثیہ سننے کے عادی ہوگئے ہیں۔ اگرچہ بالعموم مایوسی کا بادل چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ اب اُنکے دن اچھے آرہے ہیں اور اُن کا مستقبل صاف طور پر روشن نظر آرہا ہے۔ یہی وہ مضمون ہے جس کو "مسلمانوں کے روشن مستقبل" میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

طفیل احمد ۱۲/ اگست ۱۹۳۶ء



ایسٹ انڈیا کمپنی سے ان کا مقابلہ اور اس کی تدریجی ترقی دکھا کر یہہ بتایا گیا ہے کہ وہ تجارت کمپنی سے حکمراں جماعت کیسے بن گئی - یہہ باب نہایت عبرت خیز اور اثر انگیز ہے - اور جذبہ تاریخی معلومات سے لبریز -

باب چہارم کا عنوان "اصلاح مذہب و معاشرت کا پہلا دور" ہے - اس میں حضرت مولانا سید احمد صاحب رائے بریلوی رحمتہ اللہ علیہ کی تحریک جہاد کے سلسلہ میں سکھوں سے جنگ کے اسباب خصوصیت کے ساتھ دکھلائے گئے ہیں - مسلمانوں کی مذہب کے لیے قربانیاں اور اُن کے کریکٹر کی چند مثالیں بیان کر کے اس باب کو بہت ہی دلچسپ اور سبق آموز بنا دیا ہے - قدیم تعلیم کے حالات کو بیان کرنے کے بعد جدید تعلیم اس کے متعلق انگریزوں کی پالیسی اور اس کے اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے -

باب پنجم "تحریک سر سید احمد خاں" اس باب کا عنوان ہے - یہہ ایک اہم باب ہے اس باب کی چار فصلیں ہیں جن میں سر سید کی تحریک کی تفصیل ہے اور سید احمد صاحب بریلوی کی مذہبی تحریک سے اس کی امتیازی خصوصیت دکھائی گئی ہے - فصل سوم میں علی گڑھ کالج کی مکمل تاریخ ہے - نیز یہہ بتایا گیا ہے کہ ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ کن حالات میں وجود میں آئی - یہ بات زیادہ تر مصنف کے چشم دید حالات پر مشتمل ہے - چوتھی فصل میں مسلمانوں کی عام تعلیم کی ترقی کا حال ہے

اسی سلسلہ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی تاریخ ہے کہ اس نے کس طریقہ سے مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت و تبلیغ کی۔

باب ششم "ہندوستان میں سیاسی احساس" کے زیرعنوان یہہ دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان میں عہد بہ عہد کے سیاسی خیالات کی نشو ونما کس طرح ہوئی۔ جو بالآخر انڈین نیشنل کانگریس کی صورت میں بروئے کار آئے۔

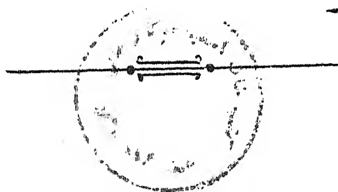
باب ہفتم اس کا عنوان "سر سید احمد خاں کی سیاست کے ۲۵ سال" ہے۔ اس میں ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے اسباب پر سر سید کی تصنیف "اسباب بغاوت ہند" کو پیش نظر رکھکر بحث کی ہے اور بنیادی حقوق کی حالت کو دکھایا ہے۔

باب ہشتم اس کا عنوان "تثلیثی دور کی سیاست کے پچیس سال" ہے۔ اس باب میں تین نامور انگریز اصحاب کے جو یکے بعد دیگرے علی گڑھ کالج کے پرنسپل رہے ہیں کارنامے دیے گئے ہیں اور دکھایا گیا ہے کہ اونھوں نے مسلمانوں کی سیاسیات میں دخل دے کر سلطنت برطانیہ کی کس طرح امداد کی۔

باب نہم "مسلمان ملکی سیاست کے میدان میں" اس باب کا عنوان ہے۔ اور اس میں مسلمانان ہند کے سیاسی کارناموں کا تذکرہ ہے جس میں کانگریس۔ تحریک خلافت جمعیتہ العلمار۔ مسلم لیگ۔ شیعہ پولیٹکل کانفرنس اور گول میز کانفرنس

وغیرہ کے تفصیلی حالات درج ہیں - اسی باب میں سلطنت ٹرکی کے انقلاب اور انگورہ کی جدید حکومت کی تاریخ بھی دی گئی ہے -

باب نہم اس کا عنوان "مسلمانوں کا ماضی حال اور منتقبل" ہے جس میں اول مسلمانوں کے ماضی اور حال پر تبصرہ کیا گیا ہے - اس کے بعد ہر بنیادی حق کی نسبت دکھایا گیا ہے کہ اُس میں کتنا حصہ حاصل ہو گیا - کتنا باقی ہے اور آیندہ کیا امکانات ہیں - مسلمانوں کی سیاسی جد و جہد کی نسبت ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ زمانہ سابق میں دیگر اقوام ہند سے پیچھے نہ تھے اور گزشتہ بیس سال میں کس حد تک کانگریس کے ساتھ اُن کا اشتراک عمل رہا اور اُس سے ملک و قوم کو کیا فائدہ پہونچا - سب سے آخر میں اُن امور کی تفصیل دی گئی ہے جن کے باعث بدیہی طور پر مسلمانوں کا منتقبل روشن نظر آ رہا ہے -



مالیات عامہ

ہندوستان کے موجودہ اقتصادی حالات پر مالیات عامہ نے جو کچھ اثر کیا اس کا بیان اور ہمارے افلاس کے اسباب پر ایک دردناک تبصرہ" ان مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہہ کتاب بڑی مفید ہے۔ مصنفہ سے جے۔ سی۔ کمارپا۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ایس۔ سی۔ مترجمہ مولوی قاضی محمد حسین صاحب قیمت آٹھ آنے (۸؍)۔

نہرو رپورٹ

ہندوستانی دستور اساسی کی تشکیل کے لیئے یہہ رپورٹ مرتب ہوئی تھی۔ جس میں سیاسیات ہند اور ہندوستانیوں کے مطالبات کا بڑی وضاحت سے تذکرہ ہے۔ قیمت مکمل ۸ر

میری کہانی

پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی کا اردو ترجمہ نہایت سلیس اور شگفتہ زبان اور اصل انگریزی کی طرح زور بیان۔ ہندوستان کی موجودہ سیاسی تاریخ پر ایک بے نظیر کتاب ہے یہ کتاب پڑھ کر معلوم کیجیئے کہ نوجوانوں کے قاعد اعظم نے ہماری تحریک اور ہمارے رہنماؤں کے متعلق کن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ حجم ایک ہزار صفحات سے زیادہ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶۔ قیمت مجلد دو حصوں میں صرف چار روپے۔

تلاش حق

مہاتما گاندھی کی آپ بیتی کا اردو ترجمہ از ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب۔ یہ وہ کتاب ہے کہ عوام و خواص دونوں اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ عام طور پر اسے پسند کیا گیا ہے۔ دونوں حصوں کا حجم تقریباً ۷۵۰ صفحات ہے۔ اور مہاتما جی کے سات فوٹو بھی دے دیئے گئے ہیں۔ کتاب اس خیال سے کہ امیر غریب ہر شخص

ملنے کا پتہ:۔ نظامی پریس بک ایجنسی بدایوں

کے ہاتھوں تک پہنچ جائے۔ دو قسم کے کاغذ پر چھپوائی گئی ہے۔ قیمت قسم اول عمدہ کاغذ دونوں حصے ؏ ۔ قسم دوم دونوں حصے ؏

سیرت محمد علی رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم کی مفصل و مبسوط سوانح عمری جو رئیس احمد صاحب جعفری نے لکھی تھی۔ چند ماہ میں اس کتاب کا دو ہزار کا ایڈیشن قریب قریب ختم ہو گیا۔ کتابت و طباعت ایسی دیدہ زیب ہے کہ دیکھکر آنکھیں کھلتی ہیں۔ مولانا مرحوم کی متعدد تصاویر بھی دی گئی ہیں۔ قیمت ؏

جمال الدین افغانی یہ وہ کتاب نہیں جو اردو اکاڈمی کا مقالہ ہے بلکہ خاص طور پر طلبا کے لیے لکھی گئی ہے سید صاحب کے حالات زندگی اور ہندوستان۔ ایران۔ ٹرکی مصر اور فرانس کے کارناموں کا تفصیلی تبصرہ ہے۔ مفتی محمد عبدہٗ اور سید صاحب کی تصاویر بھی ہیں۔ قیمت ۸

آزادی یہ جان اسٹورٹ مل کی کتاب لبرٹی کا صحیح اور با محاورہ ترجمہ ہے جو سیاسیات کے درس کا ایک اہم جزو ہے۔ مل انگلستان کے ان چند ارباب فکر میں سے ہے۔ جس نے اپنی بلند خیالی اور زور قلم سے یورپ کے اہل فکر سے اپنا لوہا منوا لیا۔ قیمت ؏

انقلاب فرانس فرانس کی تحریک آزادی اور وہاں کے انقلاب کی تاریخ میں ہمارے لیے بہت سے سبق ہیں۔ جامعہ ملیہ کے ایک لائق فرزند مولوی عبد القادر صاحب بی۔ اے نے انقلاب فرانس پر ایک عالمانہ [illegible] قیمت ۱۲

ملنے کا پتہ — نظامی پریس بک ایجنسی - بدایوں - یو - پی

مفصل فہرست نظامی پریس بک ایجنسی بدایوں سے منگایئے

دیوان غالب اُردو کا مشرح پاکٹ ایڈیشن

مصور فطرت کا لقب اگر کسی شاعر کو دیا جا سکتا ہے تو وہ غالب ہی ہے۔ ایک زبردست اور کبھی نہ پرُانے ہونے والے تخیل نے ان کے کلام کو آج کل مقبول عام بنا دیا ہے جو اس سے ظاہر ہے کہ نظامی پریس نے اس کے چھ ایڈیشن چھاپے اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے۔ قیمت فی جلد ۸؍

انقلاب دھلی

یہ کتاب اُن دردانگیز نظموں کا مجموعہ ہے جو دہلی کی بربادی ۱۸۵۷ء پر لکھی گئیں ظفر۔ غالب۔ آزردہ۔ داغ۔ حالی۔ سالک۔ افسردہ۔ شیفتہ۔ ماہر۔ ظہیر۔ عیش۔ مجروح وغیرہ ۴۶ شعرا کی ۷۰ نظمیں جو اپنے رنگ میں یکتا ہیں۔ وہ اس کتاب میں موجود ہیں۔ مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی نے اپنے مقدمہ میں جو اس کتاب میں شامل ہے بالکل سچ لکھا ہے کہ یہ کتاب "تاریخ بھی ہے مرثیہ اور نوحہ بھی ہے۔ نظم و نثر کا ایک عمدہ گلدستہ بھی ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے ان کی تہذیب کی تصویر بھی ہے جو کچھ مٹ گئی ہے اور باقی مٹ جائے گی۔ اگر آپ اس تصویر کو دیکھنا چاہتے ہیں تو انقلاب دہلی کی ایک کاپی ضرور خریدیے۔ اس کی لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ ہے۔

اس کا سرورق چار رنگوں سے چھاپا گیا ہے جس میں لال قلعہ دہلی ظفر۔ غالب سودا۔ حالی۔ داغ۔ مجروح۔ جیسے مشاہیر شعرا کی تصویریں ہاف ٹون بلاک سے چھپی ہوئی ہیں۔ قیمت فی جلد ایک روپیہ آٹھ آنے۔ (عہ)

ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش

نامور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم کے ان آٹھ خطبات کا مجموعہ جو موصوف نے جامعہ ملیہ کی دعوت پر ہندوستان تشریف لاکر جامعہ میں پڑھے۔

اصل لیکچر انگریزی میں تھے اردو ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی نے کیا ہے۔ شروع میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کا ایک جامع اور اہم مقدمہ ہے جو ترکی کی اجمالی تاریخ اور مصنفہ کے حالات پر مشتمل ہے۔ مصنفہ کی تازہ ترین تصویر بھی دی گئی ہے۔ طباعت و کتابت وغیرہ اعلیٰ حجم تقریباً (۳۰۰) صفحے اور قیمت مجلد صرف (عاصہ) دو روپے۔ انگریزی (سے) تین روپے۔

دلّی کا سنبھالا

دہلی مرحوم کی داستان الم۔ از خواجہ محمد شفیع دہلوی

"تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز"

مرحوم دہلی کے عروج کے آخری ایام کی مرقع نگاری دہلی کی اس ٹکسالی زبان میں کی گئی ہے جو اب نابود ہے۔ انداز بیان ایسا موثر ہے کہ دل بے اختیار ہو جاتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ

تاریخ فلسفہ اسلام

مشہور جرمن فلسفی ٹے، جے دی بوئر کی مقتدر تصنیف کا اردو ترجمہ۔ از جناب ڈاکٹر سید

عابد حسین صاحب ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ڈی ۔ اسلامی فلسفے کی نشو و نما ۔ یونانی ۔ عربی ۔ علوم ۔ فلسفہ فطرت ۔ یونانی و اسلامی حکمار مشرق میں فلسفہ کا انحطاط ۔ عرب اور سوفسطی فلسفہ پر کارآمد مباحث (طبع ثانی) قیمت دو روپے (عہ)

ضبط نفس اور نفس پرستی

مہاتما گاندھی کی ایک مشہور کتاب کا اردو ترجمہ ۔ از جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اس میں نوجوانوں کو بہت مفید اور علمی مشورے دیے گئے ہیں جن پر چل کر وہ اپنی زندگی کامیاب بنا سکتے ہیں اور اپنی صحت کو برقرار رکھ سکتے ہیں ۔ چاہیے کہ اسے شادی شدہ و غیر شادی شدہ دونوں بغور پڑھیں ۔ قیمت ۱۰ ار

قوم کی آواز

مہاتما گاندھی کی گول میز کانفرنس کی تقریروں کا مجموعہ اور سفر یورپ کے حالات مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب انگلستان کے مختلف طبقوں اور مختلف الخیال لوگوں سے مہاتما جی کے مکالمات و تبادلۂ خیالات کا آئینہ اور آیندہ سیاسی و معاشرتی حالات پر غائر نظر حجم تقریباً (۴۰۰) صفحات ۔ قیمت عہ

ٹوالسٹائی

روس کے قائد اعظم کی سوانح عمری قیمت صرف چار آنے (۴ر)

گلبانگ

فہمی صاحب موصوف کی سیاسی نظمیں جو شعرستان میں نہیں یہ بہت پرجوش اور ولولہ انگیز نظمیں ہیں ۔ قیمت ۶ر

ملنے کا پتہ :۔ نظامی پریس بک ایجنسی بدایوں ۔ یو ۔ پی

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۔ محمد احمد الدین پرنٹر و پبلشر


REGISTERED
NIZAMI PRESS
BUDAUN